دبستانِ آتش

شاہ عبدالسلام

دبستانِ آتش

دبستانِ آتش

ڈاکٹر شاہ عبد السلام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دھلی

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ: اردو بازار دہلی —— 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ: پرنسس بلڈنگ بمبئی —— 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ: یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

پہلی بار

قیمت ۱۶ روپے

دسمبر ۱۹۷۷

جمال پریس۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

فہرست

مقدّمہ

(پروفیسر سید شبیہ الحسن صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی)

زیرِ نظر مقالہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کی سعیٔ جمیل کا خوش گوار حاصل ہے۔ انھیں اس مقالہ پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند ملی ہے۔ مجموعی طور پر یہ مقالہ مستند تحقیق کا اچھا نمونہ ہے اور اپنے اندر ایسی زرخیزی رکھتا ہے جس سے یقیناً تحقیق کی مزید راہیں اور نئے امکانات نمودار ہوں گے۔ لکھنؤ کی ادبی تاریخ و تفہیم کے سلسلہ میں بھی یہ مقالہ ایک علمی اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

'دبستانِ آتش' کو ہماری ادبی تاریخ کی رائج اصطلاح بمشکل ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آتش کی اپنی انفرادی حیثیت ہمیشہ مسلم رہی ہے لیکن بالعموم ان وسیع اور موثر رجحانات سے غفلت برتی گئی ہے جو ان کے حلقۂ تلامذہ کے توسط سے اردو ادب کی فنی اور معنوی توسیع میں قابلِ لحاظ کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ناسخ نے لکھنؤ کی لسانی شیرازہ بندی کا ایک ایسا تاریخی کارنامہ انجام دیا اور ایک ایسے دبستان کی بنیاد ڈالی جس کا اثر عہدِ حاضر میں بھی محسوس کیا جا رہا ہے، آتش کا بنیادی کارنامہ لسانی تحفظ کے ساتھ ساتھ لکھنوی ادب کی معنوی زیبائش و آرائش ہے انھوں نے لکھنؤ کی شاعری میں نہ صرف رنگین فکر و جذبہ کی آمیزش کی بلکہ اسے احساس کی زبان بھی دی اور غزل کی اس تازگی، حیثیت اور روحانی نگار خانے کی حفاظت کی جسے لسانی اصطلاحات کی سیل قریب تھا کہ بہالے جاتی۔ انھوں نے مرصع کاری کے ساتھ غزل کے سوزِ دروں اور گرم نفسی کو برقرار رکھا یہی چیز کہیں کہیں ایسے نشتر کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھی کہ جس کی چبھن کا ذکر غالب نے بھی کیا ہے۔ حقیقتہً آتش اور ناسخ دونوں ہی مل کر لکھنؤ کی تکمیل کرتے ہیں اور اس لیے دونوں دبستانوں کا باضابطہ مطالعہ ادبی تاریخ کی

فی الحال ایک اہم ضرورت ہے۔

آتش کی دریافت کردہ معنویت اور پروردہ روایت نے لکھنؤ کی شاعری کو نہ صرف تیسرا بُعد بخشا بلکہ اس کے ادبی تشخص کی تکمیل بھی کی، آتش کی عطا کردہ اسی ادبی شخصیت کی توسیع سے ان کا دبستان وجود میں آیا جس کی ماہیت، تکوین، مدعا اور کارناموں کی معروضی تعیین اس مقالہ کا موضوع اصلی ہے۔

ادبی تاریخوں میں آتش کے صرف چند مشہور و معروف شاگردوں کا ذکر آتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تعداد وسعت اور اثر آفرینی کے اعتبار سے ان کے حلقہ کو دبستان ناسخ سے کمتر درجہ دینا ممکن نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے آتش کا دبستان زیادہ اہمیت کا حامل ہے اس لیے کہ وہ نہ صرف آتش کی معنویت و شخصیت کی نمایندگی کرتا ہے، بلکہ ناسخ کے مسلمہ لسانی اصلاحات کو بھی اپنے اندر جاذب کیے ہوئے ہے۔ آتش کے شاگردوں میں اگرچہ ایسے شعراء کی تعداد زیادہ نہیں ہے جن کی ذاتی اور قطعی انفرادیت ہو مگر ان کی مجموعی حیثیت اور مجموعی کارنامے نتیجہ خیز جد و جہد اور ادبی ہلچل کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس رست و خیز کے مطالعے، ان اسباب و علل کی تشخیص و تعین میں بھی بڑی مدد ملتی ہے جن کی بنا پر شاعری کے بہت سے ایسے اچھے نمونے وجود میں آئے کہ جنھیں صرف لکھنؤ کے لیے نہیں بلکہ اردو ادب کے لیے سرمایۂ افتخار سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبد السلام کا مقالہ انیسویں صدی کی ایک اہم ادبی شاہراہ کے نشانات اجاگر کرتا ہے اور اس پر چلنے والے ایک عظیم الشان تہذیبی اور ادبی کاروان کے نظام قیام و رحیل کے ساتھ ساتھ اس کی حدی اور درا کے صحیح آہنگ کو پیش کرتا ہے۔ انھوں نے محنت سے مواد جمع کیا ہے اور ذہانت سے نتائج نکالے ہیں اور اس ادعائیت سے اپنے کو محفوظ رکھا ہے جو اگر درست بھی ہو جب بھی علمی مطالعہ کو مجروح تو کر ہی دیتی ہے مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ تالیف علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

۱۲ر نومبر ۱۹۷۷ء　　　　شبیہ الحسن

پیش لفظ

اربابِ علم و ادب اس بات پر متفق ہیں کہ اردو نظم کے ارتقاء میں دبستانِ لکھنؤ نے نمایاں طور پر حصّہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ابو اللیث صدیقی صاحب کی تصنیف "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" ایک عظیم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موصوف کی یہ کتاب اردو نظم کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، مگر چونکہ دبستانِ لکھنؤ کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ کسی ایک محقق کے بس کا نہیں اسی لیے اس کتاب میں بھی بہت سے پہلو تشنہ نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ ایک طرح سے انھیں تشنہ پہلوؤں میں سے ایک کو اُجاگر کرنے کی ایک سعی ہے۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دبستانِ لکھنؤ کے شعراء میں ناسخ اور آتش دو ایسے اساتذہ گزرے ہیں جنھوں نے اپنے انفرادی رنگ کی وجہ سے لکھنؤ کی شاعری کو ایک نیا رجحان عطا کیا، اگرچہ یہ دونوں ہم عصر تھے مگر فنی نقطۂ نظر سے دونوں میں بہت فرق تھا اور یہ فرق ان کے شاگردوں میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس مقالہ میں انھیں دو اساتذہ میں سے ایک خواجہ حیدر علی آتش کے شاگردوں کے کلام سے بحث کی گئی ہے۔ ان کی فنی خصوصیات اور

ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آتش کے شاگردوں نے لکھنؤ کی شاعری یا لکھنؤ کے شعری مزاج پر کیا اثرات ڈالے۔

یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انیسویں صدی کے لکھنؤ کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس عہد کے سیاسی اور سماجی عناصر کس حد تک اس دور کی اردو شاعری پر اثر انداز ہوئے، اگر ایک طرف سلطنت اودھ کی معاشی فارغ البالی اور عیش و عشرت کی زندگی لکھنؤ کی شاعری پر اثر پذیر ہو رہی تھی تو دوسری طرف اس عہد کے علماء کرام اور صوفیاء عظام، خانقاہوں کی روایتی محفلیں اور مقامی علمی مراکز اس دور کی شاعری میں نئے نئے رجحانات کو جنم دے رہے تھے۔ مجموعی طور پر یہ انھیں اثرات کا نتیجہ تھا کہ لکھنؤ میں شاعری کے دو الگ الگ رنگ نمایاں طور پر منظر عام پر آ گئے۔

دوسرے باب میں لکھنؤ کی شاعری کے عام رنگ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس دور کی شاعری میں موجود ہر عنصر کو منظر عام پر لایا جائے اور کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے۔

تیسرے باب میں خواجہ حیدر علی آتش کے ذاتی حالات، ان کی زندگی کے طور طریق، عادات و اطوار اور خصائل سے بحث کی گئی ہے۔ نیز ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے انفرادی رنگ شاعری پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، یہ موضوع اپنی اہمیت کے اعتبار سے بے انتہا تفصیل کا طالب ہے اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے ایک ضخیم تصنیف کی ضرورت ہے۔ پھر بھی اس باب میں

اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ خواجہ آتشؔ کے کمالات کا کوئی گوشہ پوشیدہ نہ رہے اور یہ اجمال کسی حد تک تفصیل کا کام دے سکے۔

اس مقالے کا چوتھا باب تلامذۂ آتشؔ سے متعلق ہے، یہ باب صرف ناموں کی کھتونی نہیں بلکہ اس میں ان کے ذاتی حالات اور عادات و اطوار کے بارے میں تفصیلات بھی فراہم کی گئی ہیں اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ اس پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے، یہ باب بظاہر ایک مکمل باب ہے اور میرے محدود علم کے مطابق تلامذۂ آتشؔ کی یہ ایک مکمل فہرست ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل میں گئے بغیر صرف اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ تمام اہم تذکروں کے علاوہ شعراء کے دواوین اور تاریخ کی کتابوں سے بھی مواد حاصل کیا گیا ہے نیز یورپ اور امریکہ کے معروف کتب خانوں میں اودھ سے متعلق جو غیر مطبوعہ تاریخ و تذکرے اور دواوین موجود ہیں ان سے بھی مدد لی گئی ہے۔ مقالے کا یہ باب جتنا اہم ہے اتنی ہی اس کی تکمیل پریشان کن اور صبر آزما تھی۔ میں نے اس کی جمع و ترتیب میں اپنے بھرپور کاوش سے کام لیا ہے، پھر بھی میں اس کام کو مکمل کام نہیں کہہ سکتا، ہو سکتا ہے کہ مزید تلاش و تحقیق کے بعد اس میں قابل لحاظ اضافہ ہو سکے،

اس مقالے کے پانچویں باب میں تلامذۂ آتشؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے کلام کی روشنی میں اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ آتشؔ کے شاگردوں نے اپنے استاد کے رنگ سخن کو کس حد تک قبول کیا ہے؟ اور یہ رنگ سخن کہاں تک ان میں نمایاں نظر آتا ہے؟

چھٹے باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس دور کی شاعری پر تلامذہ آتش نے کیا اثرات ڈالے اور ان کے رنگ سخن کو معاصر شعراء نے شعوری یا غیر شعوری طور پر کس حد تک اپنایا ہے۔ ان اہم عصر شعراء میں علی اوسط رشک، خواجہ وزیر علی وزیر اور امداد علی بحر کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ بعد کے آنے والے شعرا میں امیر مینائی اور جلال لکھنوی کے کلام کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور ان باوقار شعراء کے کلام میں تلامذہ آتش کے رنگ سخن کو ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مقالے کی تدوین کا پس منظر چونکہ تلامذہ آتش کی ادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ ہے اس لیے تحقیق و تنقید کے جدید اصولوں کے پیش نظر زری مداحی سے گریز کرتے ہوئے معائب و محاسن کے سبھی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور آتش کے ہر شاگرد کو وہی مقام دیا گیا ہے جو انھیں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت حاصل تھا۔

اس مقالے پر تحقیقی کام فروری ۱۹۶۹ء میں شروع کیا گیا تھا مگر جون ۱۹۷۲ء میں اس کام کو ادھورا چھوڑ کر مجھے ساڑھے تین برس کے لیے یونیورسٹی آف منی سوٹا کے شعبہ جنوبی ایشیائی علوم میں درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے امریکہ کا سفر اختیار کرنا پڑا اس دوران وہاں کی دیگر مصروفیات کے باعث تحقیقی کام کی رفتار بے انتہا سست رہی مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح اگست ۱۹۷۵ء میں یہ مقالہ مکمل ہوا اور دسمبر ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی نے اس مقالے پر مجھے پی۔ایچ۔ڈی کی سند عطا کی۔

اس مقالے کی تیاری میں اگر اساتذۂ کرام، دوستوں اور بزرگوں کی مدد شامل نہ ہوتی تو اتنا بڑا کام کبھی بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ اس سلسلے میں بڑی ہی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے نگراں صدر شعبہ اردو محترم پروفیسر شبیہ الحسن صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں۔ یہ انھیں کی توجہات عالیہ کا ثمرہ ہے جس کی بدولت یہ مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ موصوف نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور اپنے عالمانہ اور بیش قیمت مشوروں سے نوازا، یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کتاب کا ایک مختصر مقدمہ بھی لکھ کر مجھے ممنونِ کرم کیا۔

اس مقالے کی ترتیب و تدوین کے دوران مخدومی پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب اور استاد مکرم ڈاکٹر شجاعت علی صاحب سندیلوی نے اپنے مفید مشوروں سے میری جس طرح رہنمائی فرمائی ہے اس کے شکریے کے لیے میرے پاس الفاظ کہاں۔

اس موقع پر مجھے اپنے دوست اور کرم فرما پروفیسر محمد عبدالرحمن بارکر صاحب (صدر، شعبہ جنوبی ایشیائی علوم، یونیورسٹی آف منی سوٹا) کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے انتہائی فراخدلی کے ساتھ اپنے ذاتی کتب خانہ سے استفادہ کا موقع مرحمت فرمایا، اس کتب خانہ میں بعض ایسی نادر و نایاب کتابیں دیکھنے کو ملیں جن تک رسائی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے، ان کتابوں کے مطالعے سے اس مقالے کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ اضافہ بارکر صاحب کے خلوص کا ثمرہ ہے۔

مقالے کی تکمیل کے دوران جو خلوص مجھے اپنے دوست پروفیسر

عابداللہ غازی (یونیورسٹی آف منی سوٹا - امریکہ) کی ذات میں نظر آیا اور جس طرح انھوں نے میری ہمت افزائی کی اس کے شکریہ سے نہ تو میں کبھی عہدہ برا ہو سکتا اور نہ الفاظ ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا خلوص سدا بہار ہے جس کو کسی حال میں بھلایا نہیں جا سکتا۔

آخر میں جناب محمد یونس خالدی صاحب کا بھی میں بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے مصروفیات کے باوجود قدم قدم پر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور اپنی دعاؤں سے فیض یاب کیا۔

آخری مرحلہ اس تحقیقی مقالے کی طباعت کا تھا لیکن اس مسئلہ کو محترم شاہد علی خاں صاحب (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) کی اعانت و عنایت نے آسان کر دیا۔ اب یہ میری ادبی کاوش کتاب کی شکل میں انھیں کی بدولت مکتبہ جامعہ دہلی سے شایع ہو رہی ہے۔ اگر وہ اپنے لطف و کرم سے نہ نوازتے تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ مقالہ کب تک غیر مطبوعہ شکل میں پڑا رہتا۔ میں ان کا مشکور ہوں۔

شاد عبدالسلام
لکھنؤ

۲۳ رجولائی ۷۷ ۱۹ء

باب اول

لکھنؤ کا سیاسی و سماجی پس منظر

عام طور سے ہر نئی تہذیب اور نئے ادب کا وجود کسی نہ کسی زوال کے بعد ہی ہوتا ہے ادب کسی قوم یا کسی زبان کا ہو اس کو ارتقا کے مختلف ادوار سے گزرنا بھی پڑھتا ہے۔ اردو ادب کی بنیاد بھی اس وقت پڑی جب مغل سلطنت رو بہ زوال تھی، جب مغلیہ تہذیب کے نقوش دھندلے پڑنے لگے تو ایک نئی زبان ابھر کر سامنے آنے لگی جو آگے چل کر اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ چنانچہ عہد عالمگیر سے ہی (اسی دور میں سلطنت مغلیہ کے انحطاط کی بنیاد پڑی) دلی میں اردو شعر گوئی نے رواج پایا۔ اس عہد کے نامور شعرا جیسے موسوی خاں فطرتؔ، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، مرزا عبدالغنی قبولؔ وغیرہ وغیرہ اگرچہ فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے مگر کبھی کبھی تفنن طبع کے لیے اردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے اس طرف شعرا کی دلچسپی بڑھتی رہی اور ۱۱۳۳ھ میں جب ولیؔ کا دیوان دکن سے دلی پہنچا تو اہل دلی نے اس کی بے انتہا قدر کی۔ اردو میں طبع آزمائی ہونے لگی پھر ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں شعر و سخن کی ایسی ایسی محفلیں آراستہ و پیراستہ ہونے لگیں جن کی مثالیں مشکل سے ملیں گی۔ چوں کہ اردو شاعری فارسی شاعری کے تتبع سے وجود میں آئی تھی اس لیے اس میں فارسی شاعری کے تمام تر لوازمات اور تصورات نمایاں تھے جس کی وجہ سے یہ عام فہم نہ ہو کر اہل علم اور پڑھے لکھے لوگوں کی محفلوں تک محدود ہو گئی۔ دھیرے دھیرے شعرا نے مشکل پسندی اور فارسی تراکیب سے احتراز کرنا شروع کیا اور وہ آسان شاعری کی طرف رجوع ہونے لگے۔ اس طرح اردو شاعری اپنی جملہ خصوصیات اور کرشمہ سازیوں کے ساتھ ساتھ اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب کہ دہلی کے باکمال

فن کار اور شعرا نامساعد حالات سے تنگ آکر دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد مرہٹوں اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی بغاوت اور خودمختاری نے دہلی کی مرکزی حکومت کو کمزور کر دیا تھا۔ درباری امرا اور افسران کی سازشوں اور سیاسی چالوں نے شہر کا سارا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ ہر طرف بدنظمی، بدامنی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ایسے ناسازگار ماحول میں شاعری کا احیا محال تھا نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد دہلی کے کچھ ایسے حالات ہوئے کہ وہ امرا اور رؤسا جو شعرا کی سرپرستی اور کفالت کرتے تھے یا تو خود افلاس اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ یا پھر دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ایسی حالت میں دہلوی شعرا کو بھی دہلی چھوڑ کر ہجرت اختیار کرنی پڑی۔ کچھ تو مجبوراً خلوت نشین ہو گئے، اور کچھ مختلف درباروں اور خودمختار ریاستوں میں قسمت آزمانے نکل پڑے۔ کوئی مرشد آباد چلا گیا، کسی نے عظیم آباد کی راہ لی، کسی نے فرخ آباد اور ٹانڈہ کو جائے قیام بنایا اور کچھ اودھ آ گئے جو شعرا ہجرت کر کے دہلی سے اودھ چلے آئے ان کی ایک طویل فہرست محمد باقر شمسی صاحب نے اپنی تصنیف "لکھنؤ کی زبان" میں دی ہے۔ ان شعرا میں مندرجہ ذیل — کو خاص اہمیت و شہرت حاصل ہے۔

(۱) سراج الدین علی خاں آرزوؔ (۲) اشرف علی خاں فغاںؔ (۳) مرزا رفیع سوداؔ (۴) میر تقی میرؔ (۵) شیخ عبدالرضا متینؔ (۶) اشرف علی خاں اشرفؔ (۷) میر سید محمد سوزؔ (۸) قیام الدین قائمؔ (۹) رائے سرب سنگھ دیوانہؔ (۱۰) مرزا محمد علی شہرتؔ (۱۱) منشی کشن چند مجروحؔ (۱۲) مرزا اسمعیل طپشؔ (۱۳) میر حیدر علی حیراںؔ (۱۴) بقاء اللہ خاں بقاؔ (۱۵) میر شمس الدین فقیرؔ (۱۶) شیخ عبدالرحیم رعناؔ (۱۷) میر غلام حسین ضاحکؔ (۱۸) میر مستحسن خلیقؔ (۱۹) میر غلام حسن حسنؔ (۲۰) میر مظہر علی زارؔ (۲۱) مرزا جعفر علی حسرتؔ (۲۲) میر قمرالدین منتؔ (۲۳) میر نظام الدین ممنونؔ (۲۴) شیخ قلندر بخش جرأتؔ (۲۵) میر محمد علی راحمؔ (۲۶) شیخ محمد محسن محسنؔ (۲۷) میر انشاء اللہ خاں انشاؔ (۲۸) میر شیر علی افسوسؔ (۲۹) مرزا سعادت یار خاں رنگینؔ (۳۰) شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ (۳۱) مرزا کاظم علی جواںؔ (۳۲) مرزا شرف الدین وفاؔ (۳۳) میر غلام حسین برشتہؔ (۳۴) مرزا ابو علی ہاتفؔ۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زیادہ تر شعرا نے اودھ میں آنا کیوں پسند کیا؟ سبب یہ تھا کہ دہلی اور اودھ میں بہت پہلے ہی سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا۔ محمد شاہ کی منہ بولی بیٹی

اور موتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری کی حقیقی بیٹی بہو بیگم نواب شجاع الدولہ کو منسوب تھیں یہ بڑی ہمدرد اور مہمان نواز خاتون تھیں، اور اہل دہلی کو خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ پھر اس دور میں اودھ میں ہُن برس رہا تھا۔ ہر طرف عیش و عشرت کے شادیانے بج رہے تھے۔ یہاں کی زندگی بے انتہا سکون اور اطمینان کی زندگی تھی۔ اس کشش نے دہلوی علماء، شعراء، حکماء اور دیگر فن کارانِ زمانہ کو اپنی طرف کھینچ لیا، اور یہ باکمال حضرات سکونت ترک کر کے فیض آباد آنا شروع ہو گئے یہ سلسلہ آصف الدولہ کے عہد میں اور تیز ہو گیا جب آصف الدولہ نے اودھ کا پایۂ تخت لکھنؤ کو قرار دیا تو یہ سب مشاہیر بھی لکھنؤ آگئے اور اس طرح لکھنؤ میں پہلی بار شعر و سخن کی محفل آراستہ ہوئی جو بعد میں ایک پورے دبستان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

لکھنؤ کے علمی و ادبی ماحول کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دور کے اودھ کی سیاسی اور سماجی زندگی پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔

ریاستِ اودھ

بارہویں صدی ہجری کے آخر میں چھوٹی بڑی کئی ریاستیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہوئیں، انھیں میں ریاست اودھ بھی تھی جو تقریباً ایک سو چونتیس برس قائم رہی۔ اس ریاست میں دس اشخاص[1] ایک ہی خاندان کے یکے بعد دیگرے فرمانروائے ریاست ہوئے۔ پہلی بیانوے سال مدت میں جو پانچ فرمانروا ہوئے وہ "نواب وزیر اودھ" کہلائے اور آخر کے بیالیس سال میں بھی پانچ ہی حکمراں ہوئے جو نام کے تو بادشاہ تھے لیکن حقیقت میں ان کی حیثیت انگریزوں کی بساطِ سیاست کے شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔

سلطنتِ اودھ کی بنیاد "برہان الملک" نے رکھی جن کا نام محمد امین، وطن آبائی نیشاپور

---

[1] اس میں نواب آصف الدولہ کے جانشین نواب وزیر علی خاں کے چار ماہ کے دور کو نظرانداز کیا گیا ہے، یہ ایک غریب علوی کے فرزند اور آصف الدولہ کے متبنیٰ تھے اور ان کے انتقال کے بعد جانشین بنائے گئے لیکن صرف چار ماہ بعد معزول کر دیے گئے۔

(خراسان) تھا۔ مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے اور نسباً شیعوں کے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کے ایک فرزند جناب زید کی نسل سے بتائے جاتے ہیں۔ ان کے والد کا نام سید محمد نصیر تھا، باپ کے انتقال کے بعد میر محمد امین نیشاپور سے واردِ ہند ہوئے۔ ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء میں سربلند خاں فوجدار کی ملازمت میں منسلک تھے۔ پھر فرخ سیر کے عہد میں محمد جعفر منصب دار کے توسل سے نائب کروری مقرر ہوئے اور اپنی کارگزاری کی بدولت ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء ہنڈون بیانہ کے فوجدار بنائے گئے۔ اسی زمانے میں محمد شاہ بادشاہ کے اشارے سے اپنے مربّی امیر الامرا حسین علی خاں بارہہ کے قتل کی سازش میں شرکت کی بدولت سعادت خاں بہادر کا خطاب اور پنجہزاری منصب پایا۔ پھر جلد جلد ترقی کرتے ہوئے اکبر آباد (آگرہ) کے صوبے دار مقرر ہوئے، بہادر جنگ کے خطاب سے نوازے گئے اور منصب ماہی مراتب سے سرفراز ہوئے۔ دو سال بعد ۱۷۲۲ء میں اودھ کے صوبے دار بنائے گئے۔ یہاں سب سے پہلے لکھنؤ کے شیخ زادوں کو انتہائی بے دردی سے کچل کر ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح انھوں نے اودھ میں اس حکومت کی بنیاد ڈالی جو ۱۷۲۲ء سے ۱۸۵۶ء تک قائم رہی نواب محمد امین نے اپنے صوبہ کے انتظام پر زیادہ توجہ دی اور مالی بندوبست سے محاصلِ سلطنت میں معتدبہ اضافہ کی بدولت برہان الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

برہان الملک بے انتہا ہوش مند، بیدار مغز، منتظم، جری اور تلوار کے دھنی تھے۔ ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں علاقہ دوآبہ میں ملہار راؤ ہلکر کو شکست دے کر مرہٹوں کی یورش کا استیصال کر کے ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا۔

جب ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو بادشاہ دہلی کی طرف سے مقابلے کے لیے برہان الملک بھی مع اپنی فوج کے روانہ ہوئے اور آخر کار میدان جنگ میں زخمی ہو کر جاں بحق ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نادر شاہی حملے میں برہان الملک نے نادر شاہ کو بھڑکایا اور لالچ دیا کہ بیس کروڑ روپے سے زائد رقم دہلی کے خزانے سے وصول کی جا سکتی ہے۔ جب یہ رقم نادر شاہ کو مرکزی خزانے سے نہ مل سکی تو نادر شاہ نے برہان الملک پر سختی کی اور اس نے ۱۷۳۹ء میں زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

اودھ کے بادشاہوں اور نوابوں کے دورِ حکومت کا اندازہ مندرجہ ذیل نقشے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

حکمرانانِ اودھ

(۱) برہان الملک سعادت خاں بانی سلطنت اودھ (۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء سے ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء تک)

(۲) نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ داماد برہان الملک (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء سے ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تک)

(۳) نواب شجاع الدولہ .... (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء سے ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء تک)

(۴) نواب آصف الدولہ .... (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء سے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء تک)

(۵) نواب مرزا وزیر علی خاں وزیری .... (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء صرف چار ماہ)

(۶) نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں .... (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء سے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء تک)

(۷) رفیع الدولہ شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ ...... (۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء سے ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء تک)

(۸) سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ .... (۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء سے ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء تک)

(۹) سلطان عالم محمد علی شاہ بادشاہ .... (۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء سے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء تک)

(۱۰) خاقان زماں ثریا جاہ امجد علی شاہ بادشاہ .... (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء سے ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء تک)

(۱۱) سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ .... (۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء سے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء تک)

برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے اور جعفر خاں کے بیٹے مرزا محمد مقیم نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نے نادر شاہ کے حضور میں دو کروڑ روپیہ نقد بطور نذرانہ پیش کر کے ۱۷۳۹ء میں اودھ کی صوبے داری حاصل کی۔ اس نے اپنی حکمت عملی سے بادشاہ کو بہت خوش رکھا۔ خاص کر شاہزادہ احمد شاہ (جو بعد کو بادشاہ کی مہربانیوں سے بادشاہِ وقت ہوا) صفدر جنگ سے بہت خوش تھا انھیں احمد شاہ کی سرکار سے وزیر الممالک کا خطاب بھی ملا تھا صفدر جنگ کے عہد میں ہی برہان الملک کی بسائی ہوئی بستی بنگلہ (جو اجودھیا سے چار میل دور دریائے گھاگھرا کے کنارے واقع تھی) کا نام

فیض آباد پڑا۔ یہی اودھ کی راجدھانی قرار پائی۔ ان کے دورِ حکومت میں اودھ کا انتظام مزید مستحکم ہوا۔ صفدر جنگ ۱۷۵۴ء میں بادشاہ دہلی سے ملاقات کر کے فیض آباد واپس ہو رہے تھے کہ راستے ہی میں انتقال کیا۔ نعش پہلے فیض آباد لے جائی گئی اور بعض کو فیض آباد سے شاہجہاں آباد منتقل کی گئی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے جہاں ان کا ایک شاندار روضہ تیس لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا۔

صفدر جنگ کے بعد ان کے بیٹے نواب شجاع الدولہ ۱۷۵۴ء میں اودھ کے تخت پر مسند نشین ہوئے۔ ان کا نام جلال الدین حیدر تھا یہ ۱۷۳۲ء میں بہ مقام فیض آباد پیدا ہوئے[1]۔ انھوں نے ہی لکھنؤ کو بسایا۔ یہ زیادہ تر لکھنؤ میں ہی قیام کر رکھا۔ شجاع الدولہ کے دورِ حکومت کے چشم دید واقعات فیض بخش کی کتاب تاریخ فرح بخش میں بہت تفصیل سے ملتے ہیں۔

مثلاً ہر شہر کے گانے بجانے والے قوال بھانڈ اور طوائفیں گلی کوچوں میں نظر آتی تھیں۔ چھوٹے اور بڑے سب کی جیبیں زر و جواہر سے بھری تھیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی مفلسی اور افلاس کا گزر نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق کے ایسے خواہاں تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد شاہ جہاں آباد کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا[2]۔

ظاہر ہے ایسے ماحول کا اثر اس دور کے شعر و ادب پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ مہاجر دہلوی شعرا کا وہ ذہن جس نے کہ تنگ دستی و افلاس میں نشو و نما پائی تھی اب اس رنگین ماحول میں جہاں ہر طرف عیش و نشاط، سکون و اطمینان اور فارغ البالی تھی۔ فلسفہ اور تصوف سے بے نیاز ہو کر نئے نئے تجربے کرنے لگا۔

منشی ہر چرن داس نے بھی ایک بہت ضخیم کتاب چہار گلزار شجاعی لکھی ہے جس میں شجاع الدولہ کے عہد کے حالات بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں اس میں ابتدا سے لے کر ۱۲۰۱ھ تک کے تاریخی واقعات ہیں، مصنف نے یہ کتاب ۱۱۹۹ھ میں شروع کی اور ۱۲۰۱ھ

---

[1] ضیائے اختر ص۵۔ [2] تاریخ فرح بخش۔ فیض بخش۔

میں ختم کر دی[1] شجاع الدولہ نے ۱۷۷۵ء میں بمقام فیض آباد انتقال کیا اور وہیں گلاب باڑی میں دفن کیے گئے۔

شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں مسند آرائے حکومت ہوئے۔ انھوں نے اودھ کا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا اسی دور میں لکھنؤ کو بہت فروغ ہوا۔ لیکن بہو بیگم (والدہ آصف الدولہ) کی زندگی تک فیض آباد کی رونق قائم رہی۔ ان کے یہاں کی رونق و رنگینی لکھنؤ میں منتقل ہو گئی۔ اس دور کے چشم دید واقعات منشی انعام اللہ متخلص بہ راغب نے اپنی کتاب اوصاف الآصف میں بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں[2]۔

مورخوں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ آصف الدولہ کا عہد مکمل طور پر سکون و اطمینان اور فارغ البالی کا عہد تھا۔ آصف الدولہ کے حسنِ انتظام سے رعایا بہت مطمئن تھی۔ پبلک کی پریشانی اور تکلیف کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک بار جب لکھنؤ میں قحط کے سبب سے جنتا پریشان و تباہ ہوئی تو نواب موصوف نے بہ سلسلہ رفاہِ عام امام باڑہ آصفی اور مچھلی بھون جیسی شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں جو آج بھی موصوف کی فیاضی اور رعایا پروری کی گواہی دیتی ہیں۔ مختار الدولہ ایلچ خاں، سرفراز الدولہ حسن رضا خاں اور تفضل حسین خاں کشمیری نواب آصف الدولہ کے نائبوں میں تھے۔ ان لوگوں کو نواب موصوف سے خاص قربت تھی۔ صحیح معنوں میں یہی حضرات اودھ کے منتظم تھے۔ آصف الدولہ نے جملہ بائیس برس اودھ پر حکومت کر کے ۱۷۹۷ء میں انتقال کیا۔ آصفی امام باڑہ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۸ء میں نواب وزیر علی خاں وزیری اودھ کے نواب وزیر ہوئے۔ صرف چار ماہ حکومت کر پائے تھے کہ اپنی بدعنوانیوں کے باعث معزول ہوئے۔

نواب سعادت علی خاں ۱۷۹۸ء میں تخت نشین ہوئے اور انگریزوں نے شمس الدولہ رائے رتن چند کو ان کا نائب مقرر کیا۔ سعادت علی خاں نے اپنے حسنِ تدبر سے انگریزوں کو

---

[1] بحوالہ شاہانِ اودھ کا علمی و ادبی ذوق ص۱۲۔ [2] ضیائے اختر ص۷

خوش رکھا۔ نواب سعادت علی خاں بہت ہی فہیم اور دور اندیش تھے۔ ملکی انتظام اور نظم ونسق ان کے عہد میں بہت اچھا تھا۔ ابھی صرف سولہ سال ہی حکومت کر پائے تھے کہ اجل کا پیغام آگیا اور عدم کی راہ لی۔ تاریخ انتقال یہ ہے ؎

ہاتف بگفت "آہ شدہ لکھنؤ خراب"
۱۲۲۹ ہجری

۱۸۱۴ء میں نواب غازی الدین حیدر نے اودھ کی باگ ڈور سنبھالی۔ یہ بہت ہی من موجی آدمی تھے۔ انگریزوں کی شہ پاکر ۱۸۱۹ء میں انھوں نے بادشاہ دہلی سے تعلق ختم کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اور ابوالمظفر معزالدین شاہ زمن غازی الدین حیدر کا لقب اختیار کر کے اپنا سکّہ جاری کیا اور اس طرح اودھ میں اپنی بادشاہت قائم کی۔ دراصل وہ عیش وعشرت کے پرستار تھے تیرہ برس اودھ پر حکومت کر کے غازی الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں انتقال کر گئے۔

غازی الدین حیدر کے بعد ۱۸۲۷ء میں ان کے فرزند نصیر الدین حیدر اودھ کے بادشاہ ہوئے اور منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں ان کے نائب مقرر ہوئے ان کی عیش پرستی اور لہو ولعب کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ کوٹھی فرح بخش اور دلکشا انھیں کی یادگار ہے۔ جملہ دس سال اودھ پر حکومت کر کے ۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر نے انتقال کیا۔

بعد انتقال نصیر الدین حیدر بادشاہ مرزا فریدوں بخت عرف منا جان (جس کو نصیر الدین حیدر نے اپنی فرزندی سے محروم کر دیا تھا) بلا رضامندی حکام انگریزی تخت نشین ہوئے اور فوراً قید کر کے مع بادشاہ بیگم چنار گڑھ بھیج دیے گئے۔ وہیں دونوں کا انتقال ہوا۔

۱۸۳۷ء میں نصیر الدولہ محمد علی شاہ بادشاہ ابن نواب سعادت علی خاں انگریزوں کی مدد سے اودھ کے بادشاہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں رعایا کو آرام وآسائش پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہر طرف خوشحالی اور اطمینان تھا۔ چونکہ بڑھاپے میں حکومت ملی تھی۔ اس لیے زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ جملہ پانچ سال

حکومت کرکے ۱۸۴۲ء میں راہیِ عالمِ بقا ہوئے۔ امام باڑہ حسین آباد مع بازار و عمارات عالیہ ان کی یادگار رہے ہیں

محمد علی شاہ کے بعد ۱۸۴۲ء میں ثریا جاہ امجد علی شاہ بادشاہ تختِ نشین ہوئے۔ وہ نظم و نسق کی طرف توجہ ہی نہ کر پاتے تھے۔ رعایا تباہ حال اور پریشان تھی اس غفلت و بے پروائی کے باوجود انھوں نے محلہ حضرت گنج آباد کیا۔ انھیں کے عہد میں ان کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد بسایا جو آج کل لکھنؤ کا مشہور بازار ہے۔ وہ سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور ۱۸۴۷ء میں پانچ سال حکومت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے ہی بنائے ہوئے امام باڑہ میں دفن ہوئے جو کہ حضرت گنج کے مغربی حصّے میں لب سڑک موجود ہے۔

امجد علی شاہ کے بعد ۱۸۴۷ء میں ان کے بڑے بیٹے نواب واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ ابتدا میں تو واجد علی شاہ نے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ملکی انتظامات میں اصلاح لانے کی کوشش کی اور نئے نئے اصول و قوانین وضع کیے نئے طور سے فوج کو آراستہ کیا۔ مگر بعد میں محفل رقص و سرود میں زیادہ دلچسپی لینے لگے اور اسی موسیقی کے لگاؤ سے شعر و شاعری میں دلچسپی بڑھی۔ چوں کہ خود شعر کہتے تھے اور شعرا کی قدر بھی کرتے تھے اسی لیے اس دور میں شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ مگر شومیِ قسمت کہ جنوری ۱۸۵۷ء میں جب دلی بہادر مع عالیہ بیگم لندن پہنچے تو لکھنؤ میں غدر کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کے چشم دید واقعات منشی مینڈی لال نے اپنی کتاب نونگہ موسوم بہ محاربۂ غدر میں بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"روز قیامت شہر میں برپا ہوا۔ بڑے بڑے سلاطین اور شاہزادے و نواب اور راجے مہاراجے بچوں کو کندھے پر لیے لاحول والحفیظ کہتے چلے جاتے تھے اور پیچھے پیچھے ہر قدم پر خدا کی پناہ اور رادہ کہتی بیگم صاحبہ بھی پانچ تھامے چلی جاتی تھیں اور ہندو کھترانی اور رانی مہارانی آہ مورے رام اور ہائے دیا قدم بہ قدم کہہ رہی تھیں اور راقم بھی مع والد بزرگوار اور ایک چھوٹا بھائی اور دو دختر خرد سال ہمراہ قافلہ برادری

کہ قریب ستر آدمی چھوٹے اور بڑے تھے، پیادہ پا شریک مصیبت اس بھگدڑ کے تھا۔[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

مجمل یہ ہے کہ بعد بھاگنے فوج باغی مع حکام ایک بزن گوروں کا بکھے پل کی طرف سے آیا۔ اکبری دروازے تک اس نے ستھراؤ کر دیا۔ راستے میں جو ملا اس کو قتل کیا۔ گھر گھر گورے گھسے۔ صدہا مستورات بخوف آبرو کنوئیں میں گر کر مرگئیں اور صدہا مار ڈالی گئیں۔ ہزاروں گومتی میں ڈوب مرے اور بعضے بعضے گھروں میں آدمی کا کیا ذکر چوہا تک نہ بچا۔ گھر گھر مع زن و بچہ قتل ہو گئے۔"[2]

اور پھر لکھتے ہیں:۔

"کس کس بات کا بیان کروں۔ مختصر یہ ہے کہ غدر نے گلوئے شہر کا تسمہ باقی نہ رکھا۔ یہ آشوب تا روز قیامت زبان زدِ خلائق رہے گا۔"[3]

غرض کہ سرکار انگریزی نے اہل لکھنؤ پر دل کھول کر ظلم ڈھائے۔ جابجا کہیں کہیں انگریزوں اور گوروں کے خلاف بھی دنگے فساد ہوئے۔ جس کے نتیجے میں انگریزی حکومت بہت غصہ ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا ولی عہد بہادر کو نا امیدی کے ساتھ لندن سے واپس ہونا پڑا اور واجد علی شاہ کو قلعہ فورٹ ولیم میں قید کر دیا گیا جہاں وہ دو سال دو ماہ تک قید رہے۔ پھر قلعے سے مٹیا برج میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار کر ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔

مٹیا برج کے قیام کے دوران بھی واجد علی شاہ کی علم دوستی اور ادب نوازی جاری تھی۔ اس سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب فرماتے ہیں:۔

"واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ تو علوم و فنون کا مرکز تھا ہی، ان کی قدر دانی اور سرپرستی نے مٹیا برج کو بھی چھوٹا سا لکھنؤ بنا دیا تھا۔"[4]

---

[1] فونگہ موسوم بہ محاربہ غدر ص۲۰ ۔ [2] فونگہ موسوم بہ محاربہ غدر ص۲۱

[3] فونگہ موسوم بہ محاربہ غدر ص۲۵ ۔ [4] شاہانِ اودھ کا علمی و ادبی ذوق۔

غرض اس طرح اودھ کی سلطنت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کا تسلط ہوگیا نئے نئے قوانین بنائے گئے۔ مغربی تہذیب اور لکھنؤ کے تمدن کے آپسی اختلاط سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔

سماجی پس منظر

سیاسی حالات کے اس مختصر سے جائزے کے بعد مناسب ہے کہ ایک طائرانہ نظر اس دور کے معاشرتی نظام پر بھی ڈالی جائے۔ سچائی یہ ہے کہ اودھ کی زمین بے انتہا مردم خیز سرزمین تھی۔ اسی کی خاک سے ملا نظام الدین سہالوی مولانا بحرالعلوم عبدالعلی محمد، ملا محمد حسن فرنگی محلی، مفتی محمد یوسف، مولانا حمداللہ سندیلوی (لکھنؤ میں شیعوں کے پہلے مجتہد) غفران مآب مولانا دلدار علی اور ان کے چاروں فرزندان نکلے۔ اور آخر عہد میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی مولانا محمد نعیم فرنگی محلی مفتی محمد عباس شوستری یکتائے زمانہ شمار کیے گئے۔

ملا نظام الدین سہالوی کی بدولت اس صوبہ اودھ کے ایک شہر لکھنؤ نے اس نئے دربار کے قیام سے قبل علمی دنیا میں وہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ لکھنؤ اور خاص طور پر اس کے محلے فرنگی محل کا شمار حکمت و فلسفہ، علم کمال فقہ اصول فقہ اور دیگر علوم کے گہوارے میں ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس دور کا معاشرہ موسیقی کی ہر دلعزیزی طوائف پسندی اور حکمرانوں کی ایجاد کردہ روایات سے زیادہ متاثر ہوا۔ اور ظاہر ہے معاشرے کا اثر اس دور کے ادب پر بالواسطہ پڑنا ضروری تھا اس لیے اس دور کی اردو شاعری بھی ان عناصر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

مولانا شرر نے گذشتہ لکھنؤ میں معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔

لکھنؤ میں موسیقی کو اس قدر عروج ہو گیا تھا کہ برخلاف دوسرے شہروں کے امراء و دولت مندوں کے یہاں کے امراء ذوق صحیح رکھتے ہیں، دھنوں راگوں اور راگنیوں

کو پہچانتے ہیں اور دو ہی ایک تانیں سن کر سمجھ جاتے ہیں کہ گویا کس پائے کا ہے۔ معمولی گانے والا یہاں کی صحبتوں میں فروغ نہیں پا سکتا۔ بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو سڑکوں اور گزرگاہوں پر پھرتے ہیں وہ بھی مختلف چیزوں کو ایسے سچے سروں میں ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ راگنی اور لے گلے میں اتری ہوئی ہے۔[۱]"

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب اپنی تصنیف "اردو شاعری کا سماجی پس منظر" میں لکھتے ہیں کہ:

"لکھنؤ کا تو ذکر ہی کیا سارے اودھ میں موسیقی کا اتنا چرچا تھا کہ بغیر رنڈیوں کے ناچ کے شاید ہی کوئی محفل ہوتی ہو۔ دیہات قصبات بھی گانے بجانے والوں کے بغیر شادی کا جشن پھیکا اور بے مزہ سمجھتے تھے۔ مردوں کی محفل کے علاوہ زنان خانوں میں ڈومنیاں میراثنیں رقص و سرود سے محفلیں روشن کیا کرتیں۔ موسیقی نے ایک اور محاذ اپنی سرگرمی کا پیدا کیا۔ محرم کی مجلسوں میں بھی سوز خوانی کو ابھار کر اس طرح نمایاں کیا کہ ہر گھر میں اس کا دور دورہ ہو گیا۔[۲]"

غرض یہ کہ حکمرانانِ اودھ نے موسیقی اور موسیقاروں کی سرپرستی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ حکمرانان اودھ کی سرپرستی، ہمت افزائی اور ذاتی دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا کہ آصف الدولہ کے دربار میں خوشی جی مہراج مشہور رقاص، غازی الدین حیدر کے دربار میں حیدری خاں مشہور گویا اور چھجو خاں اور غلام رسول خاں مشہور قوال اور واجد علی شاہ کے دربار میں پیارے خاں، جعفر خاں، باسط خاں اور حیدر خاں جیسے مشہور گویے اور قطب الدولہ جیسا مشہور ستار نواز اور دیگر فن کاروں نے اپنے اپنے فن میں کمال حاصل کر کے خوب نام کمایا اور تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئے۔

یہی نہیں بلکہ حکومت کی سرپرستی کی بدولت اودھ میں ہر طرف موسیقی کا دور دورہ

۱؎ گذشتہ لکھنؤ ص ۲۰۶ مطبوعہ نسیم بکڈپو۔ ۲؎ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ص ۲۶۳ ڈاکٹر اعجاز حسین۔

تھا۔ دربار سے لے کر عوام تک سبھی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ مذہبی رسوم میں بھی موسیقی کو خاصا دخل حاصل ہوا۔ چوں کہ فرمانروانانِ اودھ شیعہ تھے اور شیعہ مذہب میں عزاداری کو جو مقام حاصل ہے وہ ظاہر ہے، اسی لیے عزاداری کو پُراثر بنانے میں موسیقی کی مخصوص دھنوں کا سہارا لیا گیا اور سوز خوانی میں زیادہ سے زیادہ دلکشی پیدا کرنے کے لیے اسے راگ اور راگنیوں سے آراستہ کیا گیا جس نے کہ سوز خوانی کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا۔ صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ہندوانہ رسم و روایات کے اثرات اور موسیقی کی ہر دلعزیزی نے مل کر کچھ اور ہی گل کھلایا۔ مذہبی رسوم میں دھیرے دھیرے نئی نئی باتوں کو جگہ دی جانے لگی۔ خاص کر نواب بادشاہ بیگم[1] نے تو شیعہ مذہب کو بازیچۂ اطفال بنا دیا اور پھر انھیں کی پیروی کرتے ہوئے اودھ کے دوسرے بادشاہ نصیر الدین حیدر نے اس میں مزید رنگ آمیزی کی۔ اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے مولانا عبدالحلیم شررؔ اس طرح رقم طراز ہیں:

"بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں جن کی وجہ سے یہی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوئیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نرالی اور عجیب ہو گئی۔ سب سے پہلے بیگم صاحبہ (بادشاہ بیگم) نے امام (مہدی) صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی۔ ہندوؤں کی جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچہ خانہ مرتب کیا جاتا۔ اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوب صورت لڑکیاں لے کر ائمہ اثنا عشر کی بیویاں قرار دی گئیں جن کا نام اچھوتیاں رکھا گیا اور وہ جب اماموں کی بیبیاں تھیں تو ان کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی اور بارہوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کرّوفر کے ساتھ منائی جاتیں۔"[2]

نصیر الدین حیدر کے حالات کے ضمن میں مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھتے ہیں:

---

[1] پہلے بادشاہ اودھ غازی الدین حیدر کی بیگم تھیں۔ [2] گذشتہ لکھنؤ ص

مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمہ اثنا عشر کی فرضی بیویاں (اچھوتیاں) اور ان کی ولادت کی تقریبیں جوان کی ماں نے قائم کی تھیں ان کو اور زیادہ ترقی دی یہاں تک کہ ولادت ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کر زچہ خانے میں بیٹھتے چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لیے ولادت چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھیں سے فرصت نہ ملتی سلطنت کی طرف توجہ کون کرتا۔[۱]

منشی عبدالاحد رابطہ (جو عہد نصیرالدین حیدر میں لکھنؤ رزیڈنسی کے دفتر میں سررشتہ دار تھے) اپنی تصنیف "وقائع دلپذیر" میں چشم دید واقعات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ہر گاہ روز ولادت کدام امام فرخندہ فرجام رسیدے مثلِ زنان باردار خود را بہ دردِ زہ و طلق و مخاض از راہ تصنع مبتلا ساختے و بجائے طفل یک لعبت مرصع پیشش می گذاشتند و خود در زچہ خانہ می نشستند و پرستاران مخصوصہ ایں خدمت طعامے را کہ برائے زچہ معین است بہ کمال احتیاط پختہ می خورانیدند و در آں ایام کسی آنحضرت را مس نمی ساخت و ہر گاہ ششم روز می شد۔ آنحضرت غسل می فرمودند و پرستارے آں طفل جواہر نگار را بہ یک گوشہ بردہ بدست گرفتہ می ایستاد و پرستار دیگر سبوچہ آب را در آنجا فرو می ریخت ایں را بجائے غسل طفل قرار دادہ بودند۔[۲]

ظاہر ہے شاعری انسانی ذہن کی پیداوار ہے جو اپنے ماحول اور گرد و پیش سے پوری طرح متاثر ہوا کرتی ہے نصیرالدین حیدر (جو کہ خود شاعر تھے اور جان نثار اور علی حیدر تخلص کرتے تھے) کا اپنا کلیات[۳] بھی ان ہی فضولیات سے بھرا پڑا ہے نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

---

[۱] گذشتہ لکھنؤ ص۔ شرر۔ [۲] وقائع دلپذیر، مصنفہ عبدالاحد رابطہ (فارسی عبارت ماخوذ از "آخری تاجدارِ اودھ" مصنفہ محمد تقی۔

[۳] کلیات نصیرالدین حیدر قلمی نسخہ۔

در بیان چھٹی حضرت امام حسن عسکری صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہٗ

ہے حضرتِ عسکری کی چھٹی دو جہاں میں آج — حق نے رچایا جشنِ خوشی لامکاں میں آج
ساتوں فلک ہیں اور ملک سارے رقص میں — نغمہ سرا ہیں حوریں نبی کے مکان میں آج
اے جانِ نثار سن کے خبر ایسے جشن کی — رنگ کھیلتی ہیں حوریاں باغِ جناں میں آج [1]

در بیان پالنا حضرت امام مہدی علیہ السلام

پالنا لائی ہیں حوریں شاہِ دیں کے واسطے — مہدی ہادی پیارے نازنین کے واسطے
پھندنے ہیں شمس و قمر کے کہکشاں کی ڈوریاں — پالنے میں ہیں لگیں اس مہ جبیں کے واسطے

در بیانِ ولادت حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام

ہوئی ہے خوشی سارے کون و مکاں میں — ہوئے ہیں حسن جلوہ گر اس جہاں میں
علی اور زہرا نے شادی رچائی — خوشی ہو رہی ہے نبی کے مکاں میں
علی حیدر اے شاہ رکھتا ہے یہ غرض — ملے جامِ کوثر مجھے اس جہاں میں [2]

در بیانِ تولد حضرت فاطمۃ الزہرا صلوٰۃ اللہ علیہا والسلام

گھر میں نبی کے پیدا ہوئیں جس گھڑی بتول — مانندِ گل کے شاد ہوئے اس گھڑی رسول
مداح آپ کا علی حیدر ہے روز و شب — صدقے سے آپ کے اسے جنت ہو داں حصول [3]

در بیان چوتھی حضرت امیر علیہ الصلوٰۃ والسلام

عرش بریں پہ دھوم ہوئی ہے کیا ہی علی کی چوتھی کی — زہرا علی کو گھر میں بلا کے آج نبی نے چوتھی کی
نور کی چھڑیاں نور کی گیندیں بھیجی ہیں حق نے ان کے لیے — ارض و سما میں دھوم مچی ہے نام خدا اس چوتھی کی [4]

---

[1] کلیات نصیر الدین حیدر ص۔ [2] کلیات نصیر الدین حیدر ص۔
[3] کلیات نصیر الدین حیدر ص۔ [4] کلیات نصیر الدین حیدر ص۔

نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے دور میں موسیقی اور راگ و رنگ کا زور کم ہو گیا، کیوں کہ خود ان حکمرانوں کو ان فنون سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ مگر آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے دور میں موسیقی کو پھر سے قبولیت کا درجہ حاصل ہوا اور چوں کہ بادشاہ کو ذاتی طور پر موسیقی سے لگاؤ تھا اور خود فن موسیقی سے بخوبی واقف تھے (جس کا ثبوت ان کی تصانیف "بنی" "دلہن" اور "ناجو" ہیں) اس لیے فن کاروں کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے تھے، اسی دلچسپی کا نتیجہ یہ نکلا کہ رہس کو عملی شکل دے کر اہل ذوق کے لیے تفریح کا ایک نیا سامان مہیا کر دیا گیا اور جب امانت کی اندر سبھا" اور خود واجد علی شاہ کی "مثنوی دریائے تعشق" ڈرامے کی شکل میں منظر عام پر آئی تو لکھنؤ میں ایک تہلکہ مچ گیا اور ہر طرف ناچ گانے اور ڈرامے کا بازار اور گرم ہو گیا۔ سوسائٹی میں رقص و سرود اور طوائف کو ایک خاص مقام مل گیا۔ مولانا شرر لکھتے ہیں۔

"لکھنؤ میں بازاری عورتوں کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا کہ مہذب و شائستہ امرا کی محفلوں میں ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھتیں اور یہاں اس مذاق میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ بعض مہذب رنڈیوں نے بھی اپنے گھروں میں نشست و برخاست کی ایسی صحبتیں قائم کر دیں جن میں جانے سے بہت سے مہذب لوگوں کو بھی شرم نہیں آئی۔ لکھنؤ میں چودھرائن، بی حیدر جان اور اسی پائے کی چند رنڈیوں کے مکان اچھے خاصے شرفاء کے کلب تھے"[1]

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اس ذوق و شوق کو اس طرح عروج ہوا کہ طوائف پسندی تہذیب یافتہ ہونے کی دلیل ہو گئی۔ طوائفوں کے مکانات ایسی درس گاہ بن گئے جہاں نرم و نازک چیزوں سے فیض یاب ہونے کی تعلیم ہوتی، جہاں عاشق

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۱۶ شرر

معشوق کی تربیت ہوتی ۔ کوئی رئیس اس وقت رئیس نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ اس کے پاس طوائف بھی ملازم نہ ہو جو جتنا بڑا رئیس ہوتا تھا اتنی ہی زیادہ طوائفیں نوکر رکھتا تھا۔[۱]

غرض کہ اس دور کا معاشرہ طوائف پسندی سے پوری طرح متاثر تھا، طوائفوں کی زندگی نے اس دور کی شاعری کو بھی متاثر کیا جس کے نتیجے میں بیشتر شعراء کی تخیل معشوق کی کنگھی چوٹی، عشوہ و غمزہ اور سراپا تک محدود ہو کر رہ گئی، قد و قامت، چال ڈھال سج دھج کی مبالغہ آمیز تعریف عام ہو گئی جس کی بدولت لکھنؤ کی شاعری اپنے اس داخلی حسن سوز و گداز اور درد و اثر سے محروم ہونے لگی جو اسے ورثے میں دلی سے ملا تھا۔

طوائف پسندی کے باعث معاشرے میں نازک مزاجی اور تکلفات کو دخل حاصل ہو گیا، آداب مجلس، طرزِ گفتگو، انداز بیان، وضع قطع، غرض کہ زندگی کے ہر پہلو پر اس نازک مزاجی کا اثر نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔ یہاں تک کہ اس دور کی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ زبان میں رائج ثقیل اور کانوں کو گراں گزرنے والے الفاظ دھیرے دھیرے متروک ہونے لگے اور خوب صورت اور کانوں کو اچھے لگنے والے الفاظ کو اپنایا جانے لگا یہ اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ لکھنؤ میں باقاعدہ زبان کی اصلاح پر توجہ دی گئی جس کا سہرا ناسخ کے سر بندھا۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے۔

> لکھنؤ میں تلفظ اور الفاظ کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں شین قاف کا درست ہونا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ آدمی کا لکھا پڑھا ہونا کلام کو شائستگی سے ادا کرنا ایک خاص بات ہو گئی تھی پڑھے لکھوں کا تو ذکر کیا ہے ناخواندہ لوگ بھی صحیح الفاظ و محاورے ادا کرتے، ماحول نے معمولی ۔ دکان دار کو بھی یہ اندازِ گفتگو سکھا دیا تھا۔ کمہار اور مزدور بھی

---

[۱] اردو شاعری کا سماجی پس منظر ص۔

جنچی تلی زبان اور معقول طرزِ کلام کے عادی ہو گئے تھے غرض کہ الفاظ اور اندازِ گفتگو میں اس وقت کے لکھنؤ کی تہذیب سارے ہندستان میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی یہاں تک کہ ضرب المثل بن گئی۔"[1]

اس دور کے شعرا کا یہی رویہ تھا۔ وہ کلام کے سارے حسن کو معنوی خوبصورتی پر ترجیح دیتے تھے، یہی سبب تھا کہ آگے بڑھ کر لکھنؤ کی شاعری درد و اثر سے تو محروم ہو گئی، مگر اندازِ بیان اور ظاہری حسن و خوبی میں اپنا سکّہ منوالیا۔

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، فرنگی محل علم و ادب کا مرکز تھا اس عربی علم و ادب کی فضا نے اس دور کی اردو شاعری پر بھی خاصا اثر ڈالا۔ چونکہ اس دور کے پڑھے لکھے طبقے کا ذہن عربی علوم و فنون سے پوری طرح متاثر تھا، اس لیے ان کی زبان میں بھی عربی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ کلام کے ظاہری حسن کو دوبالا کرنے کے لیے عربی کے مشکل الفاظ کا بھی سہارا لیا گیا چوں کہ فارسی تہذیب و ادب عرصہ دراز سے ہندستان پر حاوی تھا اس لیے فارسی کے اثرات بھی بہت ہی واضح طور پر سامنے آئے۔ یہ اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ لوگوں میں مشکل پسندی کا رجحان پیدا ہوا مشکل تراکیب، پیچیدہ مضامین، عربی و فارسی کے مغلق الفاظ کا استعمال، سبھی کچھ خندہ پیشانی کے ساتھ جائز قرار دیا گیا، اور اس وجہ سے بھی عام طور پر شعرا کی تمام تر توجہ کلام کے ظاہری حسن پر مرکوز ہو گئی۔

---

[1] اردو شاعری کا سماجی پس منظر ص۔

باب دوم

دبستانِ لکھنؤ

اودھ کی سرزمین ابتدا سے ہی اردو شاعری کے لیے زرخیز ثابت ہوئی۔ دہلی کے پریشان حال اور آفت زدہ شعرا یہاں پہنچے تو ان کو یہاں ایسا ماحول ملا جو اُن کے لیے کسی حد تک نیا تھا۔ ظاہر ہے فن کار کا ذہن، اور ان کے جذبات، اپنے ماحول اور گردوپیش سے ضرور متاثر ہوا کرتے ہیں، اس لیے یہ شعرا بھی عیش و عشرت کے اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے تخیلات، جذبات و احساسات میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی، وہی شعرا جو کبھی حسن و یاس، رنج و الم، فلسفہ و تصوف کے رموز و نکات بیان کرتے تھے، اب صرف وصلِ جاناں، اور معاملاتِ حسن و عشق کے ترانے الاپنے لگے، اور ان کی ساری صلاحیتیں محدود ہو کر رہ گئیں۔ دراصل ان ہی مہاجر شعرا نے اپنے معاشرے سے متاثر ہو کر لکھنؤ میں اردو شاعری میں ایک نئے رجحان کی بنیاد ڈالی، جو دہلی کی شاعری سے کسی حد تک مختلف تھا، یہ رجحان دھیرے دھیرے نشوونما پاتا رہا، پھر ناسخ و آتش جیسے اساتذہ نے اپنی اپنی جدتِ طبع سے اس میں رنگ آمیزی کی۔ ناسخ نے زبان کی ندرتوں اور قواعد کی پابندیوں کی طرف خاطر خواہ توجہ کی، زبان کی صفائی محاورات کی صحت، الفاظ کی تزئین، اور متروکات کے اصول وضع کیے۔ اسی طرح خواجہ آتش نے بھی جذبات کی ہم آہنگی، تخیل کی بلندی، اندازِ بیان کی سلاست، طرزِ ادا کا اچھوتا پن،

اور تشبیہات کی لطافت پر خاص توجہ کی۔ جس سے اردو شاعری کا ایک نیا گلدستہ تیار ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ غرض کہ انھیں اساتذہ کے اثرات کے تحت ان کے تلامذہ اور دیگر ہمعصر شعرا کی پرورش ہوئی، اور پھر لکھنؤی شاعری دہلی سے اس قدر مختلف ہو گئی کہ اردو شاعری کے دو الگ الگ دبستان یا اسکول قرار دیے گئے اور دہلویت اور لکھنویت کی اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ پھر آگے چل کر محققین اور اہلِ قلم حضرات نے دونوں دبستانوں کی الگ الگ خصوصیات اور ان کے خط و خال کا تفصیلی جائزہ لے کر ان دبستانوں کی حیثیت مسلم کر دی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں رقم فرمایا ہے۔

"جرأت، انشاء، مصحفی اور رنگین کی شاعری کی ابتدا دہلی سے ہوئی مگر ان سب کا عروج لکھنؤ میں ہی ہوا۔ اور انھیں کے اثر سے لکھنؤ میں شاعری کا ایک نیا دبستانِ ناسخ اور آتش سے شروع ہوا۔ ان لوگوں نے زبان کی اصلاح کی، محاورے کو درست کیا، نئی بندشیں اور ترکیبیں ایجاد کیں زبان و بیان میں لطافت و نزاکت پیدا کی۔ مضامین میں ایجاد سے کام لیا اور شاعری کو نیا آب و رنگ بخشا۔"[۱]

پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے لکھنویت کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

دراصل لکھنویت، دہلویت کے مقابلے میں شعر و شاعری کا ایک دوسرا رخ ہے۔ دہلی کے وہ شعرا جو لکھنؤ آ گئے تھے یہاں کے تمدن اور خوشحالی سے متاثر ہوئے اور ان کے کلام میں دہلی سے علاحدہ بعض چیزیں پائی جانے لگیں جنھیں بعد میں بعض لکھنوی شعرا نے اپنایا اور چمکایا، مثلاً جہاں تک مشکل گوئی کا تعلق ہے سودا اور میر کی کئی غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں۔ انشاء و مصحفی کے معرکوں نے مشکل زمینوں میں دو غزلے اور سہ غزلے کہنا قادر الکلامی کی سند ہی قرار دے دیا۔ یہی لے تھی جو آگے

۱۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۳۳

چل کر ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں میں بڑھ کر اپنی انتہا کو پہنچ کر لکھنوی خارجی شاعری کی ایک خصوصیت قرار پائی۔[1]

موصوف نے خارجی حسن شعری کی توجیہہ فرمائی ہے۔

"لکھنؤ کے شاعر چوں کہ زیادہ ڈوب کر نہیں لکھتے اس لیے لفظی عشوہ گری سے کام نکالتے ہیں وہ عشق کو موضوع سخن سمجھتے ہیں، عشق کی وارفتگی ان کے بس کی نہیں۔ صرف آتش ایسے ہیں جو مصحفی کے اثر سے لکھنؤ کی سرد فضا میں اپنی شعلہ نوائی سے کچھ گرمی قائم رکھتے ہیں۔[2]"

تذکرہ "شعرالہند" میں مولانا عبدالسلام ندوی نے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کی مندرجہ ذیل خصوصیات بتائی ہیں۔

(۱) لکھنؤ کے تمدن اور معاشرت میں عام طور پر جو زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا اس کا اثر وہاں کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ شعرائے لکھنؤ کے دواوین میں عورتوں کے زیورات پوشاک اور سامانِ آرائش کی مکمل فہرست ملتی ہے۔

(۲) لکھنؤ کی شاعری فارسی کی دلآویز ترکیبوں سے خالی ہے حالاں کہ فارسی کی دلآویز ترکیبیں شعرائے دلّی کے یہاں بکثرت ہیں لیکن یہ شعرائے لکھنؤ کا عیب نہیں ہے کیوں کہ بے میل زبان بھی قابل فخر ہے۔

(۳) شعرائے دلی مختصر غزلیں لکھتے ہیں لیکن شعرائے لکھنؤ سیر حاصل۔ بعض اوقات دو غزلہ اور سہ غزلہ۔ ابتدا جرأت و مصحفی نے کی اور شعرائے لکھنؤ نے کمال کو پہنچا دیا۔

(۴) شعرائے لکھنؤ کے ہاں داخلی جذبات کم اور معشوق کے خارجی اوصاف کا ذکر زیادہ ہے۔

(۵) رعایت لفظی کی طرف شعرائے لکھنؤ کا رجحان زیادہ ہے۔

(۶) ابتذال عام ہے۔

(۷) شعرائے لکھنؤ کا عام رنگ حد اعتدال سے بڑھی معاملہ بندی ہے۔

---

[1] دلی کا دبستان شاعری ص ۲۷۸۔ [2] دلی کا دبستان شاعری ص ۲۷۸

(۸) تشبیہات واستعارات کی نزاکت و لطافت مفقود ہے اکثر ابتذال کا رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے۔

پروفیسر عندلیب شادانی نے دبستان لکھنؤ کی جانب مندرجہ ذیل خصوصیات منسوب کی ہیں۔[۱]

(۱) لکھنؤ اور دلی کی شاعری میں جنس کا تفاوت ہے۔ لکھنوی شعرا کی محبوبہ لازمی طور سے صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہے پھر ان میں (عاشق) کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو پردہ نشین سے محبت کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو زنان بازاری کے دلدادہ ہیں۔

(۲) لکھنوی شعرا سامانِ آرائش کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں، مثلاً زلف۔ کاکل جوڑا چوٹی۔ کنگھی۔ سرمہ۔ مسّی وغیرہ۔

(۳) مستورات کے زیورات کی تفاصیل لکھنوی شعرا کے یہاں بہت ہے بلکہ لکھنوی شاعری زیورات کا صندوقچہ یا جوہری کی دکان کہی جا سکتی ہے۔

(۴) لکھنوی شاعری میں نسوانی لباس کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔

(۵) لکھنوی شاعری میں اعضائے نسوانی کا تذکرہ تفصیل اور عریانی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

(۶) ہندوانہ سماج' ہندوانہ رسم ورواج' اور روایات کا اثر لکھنوی شاعری میں نمایاں طور پر ہے۔

(۷) لکھنوی شعرا کو پھبتی کہنے کا بہت شوق ہے۔

(۸) لکھنوی شاعری میں مضحکہ خیز مبالغوں کا استعمال کثرت سے ہے۔

(۹) لکھنوی شاعری کی ایک نہایت اہم خصوصیت غزلوں کے مقطعوں میں رسول مقبولؐ پنجتن یا ائمہؑ کے توسل سے طلب نجات ہے۔

منشی دیبا پرشاد حسین جھنجھانوی نے اپنی کتاب "اختلاف اللسان" میں لکھنؤ اور دلی کی معنوی اور لفظی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے لکھنوی شاعری کی خصوصیات اس

---

[۱] تحقیق کی روشنی میں ص۔ عندلیب شادانی۔

طرح بیان کی ہیں:"

لکھنؤ:۔ اردوئے معلّےٰ ۔ بلاغت ۔ رنگینی ۔ رعایت لفظی ۔ واہ

نورالحسن ہاشمی صاحب نے جھنجھانوی صاحب کے مندرجہ بالا فارمولے کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

لکھنؤ:۔ (معنوی حیثیت سے) خارجی مضامین (خصوصاً عورتوں کے سراپا زیور اور ملبوسات کے متعلق)، تمثیلیت ۔ مضمون بندی ابتذال۔

(لفظی حیثیت سے) قافیہ پیمائی ۔ رعایت لفظی ۔ لغت سازی ۔ غرابت، خوبی بندش۔

مشاہیر علم وادب، اور ناقدین زبان و بیان کے مندرجہ بالا خیالات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے تہذیب و تمدن کے اثر سے یہاں کی شاعری مشکل پسندی، سوز و گداز داخلیت اور دیگر دہلوی خصوصیات سے محروم ہو چکی تھی اور اہل لکھنؤ کی سرمستی اور خوشیوں نے انھیں صرف خارجی شاعری یعنی حسن و عشق کے سطحی معاملات سے لطف اندوز ہونے کا ذوق عطا کیا تھا لکھنؤ کے امرار و رؤسا اور حکمرانوں کی پست مذاقیوں کی بدولت لکھنوی شعرا بازاریت کی طرف مائل تھے۔ عام طور پر شعرار کے جذبات سوز و گداز اور اثر آفرینی سے نا آشنا اور لفظی شعبدہ بازیوں میں گرفتار تھے۔ گویا لکھنؤ کے شعرا میں اعلیٰ اور حقیقی خیالات ادا کرنے کی صلاحیت مفقود تھی۔ اور لکھنؤ کی شاعری ہوس پرستی اور عیاشی کا وسیلہ بنی ہوئی تھی۔

درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کہ لکھنؤ کی شاعری ہوسناکی اور عیش پرستی کی شاعری ہے۔ مناسب نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہاں کی عیش پرستی راگ و رنگ اور فارغ البالی نے لکھنؤ کی شاعری کو متاثر کیا اور یہاں کی شاعری کا ایک بالکل نیا رنگ جو دہلی کی شاعری سے کسی حد تک مختلف تھا نکھر کر منظر عام پر آیا لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کی بنیادیں ان مہاجر شاعروں کے ہاتھوں رکھی گئی تھیں جو دہلی سے ترک سکونت کر کے یہاں آئے تھے پھر اس کی تمام تر ذمہ داری لکھنؤ یا لکھنوی شعرا پر ڈال دینا انصاف نہ ہوگا۔ عام طور پر لکھنؤ کی شاعری کے بارے میں ارباب علم وادب کا

یہ نظریہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری خشک بے جان اور جامد ہے اس میں سوائے کنگھی چوٹی کے بیان اور گل و بلبل کی داستان کے سوا کچھ نہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو بعض لکھنوی شعرا کے یہاں بھی دہلی کی جملہ خصوصیات نظر آئیں گی، ان کے یہاں بھی خارجی مضامین کے ساتھ ساتھ داخلی مضامین ملیں گے ان کے یہاں بھی تصوف و فلسفہ کے دھندلے نقوش ابھر کر سامنے آئیں گے۔ ان کے یہاں بھی تشبیہات واستعارات کی چاشنی نظر آئے گی وہ بھی ہجر و فراق کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، اور اُف نہیں کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ ان داخلی رجحانات کے علاوہ لکھنؤ کا عامیانہ رنگ بھی ان شعرا کے یہاں بدرجہ اتم نظر آئے گا۔ اور اسی عامیانہ رنگ کی کثرت کی وجہ سے دبستانِ لکھنؤ کی دیگر خصوصیات طاق نسیاں ہو گئیں، اور لکھنؤ کی شاعری صرف مبالغہ آمیزی عیش پرستی اور ہوس ناکی کی شاعری قرار پا گئی۔

لیکن جب ہم دبستانِ لکھنؤ کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے ایسے بھی شعرا آتے ہیں، اور ایسا بھی کلام ملتا ہے کہ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں بھی داخلی رنگ کثرت سے موجود ہے اور لکھنؤ کے بعض شعرا دہلی کے رنگ شاعری سے قریب تر ہیں۔ ثبوت کے لیے خواجہ حیدر علی آتش کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ظہورِ آدم خاکی سے یہ ہم کو یقین آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا

عدم سے جانبِ ہستی تلاشِ یار میں آئے
ہوائے گل سے ہم کس وادیٔ پُرخار میں آئے

تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکارئے

سمجھتا یا نہ اسے آتش سمجھتا
دلِ مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا　　شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تیری آواز کا

معرفت میں تیری ذاتِ پاک کے　　اُڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

خوشا وہ دِل کہ ہو جس میں آرزو تیری　　خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے　　یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں　　روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

جاں ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ　　ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

شیخ امام بخش ناسخ کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں صرف الفاظ کا کھیل اور زبان و بیان کی خوب صورتی ہے۔ تخیل کی بلندی، عشق و محبت کا سوز اور سلالت نام کو بھی نہیں۔ حالاں کہ مندرجہ ذیل اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ ناسخ کی شاعری میں دلی کا ذہن بھی موجود ہے اور انداز بیان بھی۔ اگرچہ ایسے اشعار بہ کثرت نہیں ہیں لیکن پھر بھی اتنے ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ناسخ فرماتے ہیں۔

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے　　آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

دِل ہی اس کو جانتا ہے جس پہ گزرے ہے یہ حال　　عشق کا صدمہ زبانوں سے بیاں ہوتا نہیں

یہ زمیں ہے بے وفا یہ آسماں بے مہر ہے　　جی میں ہے اب ایک نیا عالم پیدا کریں

ابرِ رحمت سے تو محروم رہی کشت میری   کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی

کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے   نہیں پائے کہیں سراغ اپنا

ہماری جامہ دری میں ہے گل کی کب تقلید   یہ وہ جنوں ہے کہ وابستۂ بہار نہیں

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی   عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

طولِ شبِ فراق کے شکوے سے فائدہ   میں جاں بلب ہوں مجھ کو امیدِ سحر کہاں

امانت لکھنوی کے یہاں بھی اس رنگ کے اشعار ڈھونڈنے سے مل جاتے ہیں ؎

ہچکیاں آتی ہیں کیوں عالمِ غربت میں ولا   کیا عزیزوں کو میں آوارہ وطن یاد آیا

گلشنِ دہر تلک آئی برس دن میں بہار   اس سبکدوش کو بھاری ہوئی منزل کیا کیا

ابتدا عشق کی ہے دیکھ امانتؔ ہشیار   یہ وہ آغاز ہے جس کا کوئی انجام نہیں

دل نے شبِ فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا   مونس اسے کہتے ہیں غمخوار اسے کہتے ہیں

لطفِ یار کی ایک گھڑی ہجر کا برسوں غم ہے   فرصتِ عیش زمانے میں نہایت کم ہے

پتھرا گئیں آنکھیں اسی حسرت میں ہماری   تم چشمِ مروت سے اشارہ نہیں کرتے

رندؔ کے یہاں بھی یہ رنگ ملاحظہ ہو ؎

کیا ملا عرضِ مدعا کر کے ‌ ‌ ‌ ‌ بات بھی کھوئی التجا کر کے

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں ‌ ‌ ‌ ‌ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زبان صیاد ‌ ‌ ‌ ‌ میں ماجرائے چمن کیا کروں بیان صیاد

غرض نہ دیر سے مقصد نہ کعبہ سے اے دوستؔ ‌ ‌ ‌ ‌ میں تجھ کو ڈھونڈ رہا ہوں کہاں کہاں کب کا

دیکھ کر دامنِ صحرا کو چمن یاد آیا ‌ ‌ ‌ ‌ سیرِ غربت میں جو کی ہم نے وطن یاد آیا

یارب بہارِ گلشنِ ہستی سدا رہے ‌ ‌ ‌ ‌ بلبل ہزار رنگ کا آ کر چہک گیا

ناز بے جا اٹھایئے کس کے ‌ ‌ ‌ ‌ اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا۔

ایک نظر جس نے تجھ کو دیکھ لیا ‌ ‌ ‌ ‌ عمر بھر در پے سراغ رہا

رنج میں بھی ہے مزا ذوقِ محبت ہے اگر ‌ ‌ ‌ ‌ اس طرح شاد ہیں اپنے دلِ ناشاد سے ہم

میر علی اوسط رشکؔ کے ہاں اگرچہ ایسے اشعار کم ہیں مگر ان کا رنگ سخن ملاحظہ ہو۔

نشانِ عاشقی در پردہ تھا جب تک گریباں تھا ‌ ‌ ‌ ‌ چراغِ داغِ دل گویا چراغِ زیرِ داماں تھا

رشکؔ کیا کیجیے سیرِ گلشنِ دہر ‌ ‌ ‌ ‌ باغ میرا نہ باغباں میرا

انداز رقیبانہ ہیں ناصح کے سخن کے   اب خضر کو بھی حوصلہ ہے راہزنی کا

طولِ شبِ ہجر کا ہے احساں   قصہ کوتہ ہوا ہمارا

خواجہ وزیر کے یہاں یہ رنگ سخن نمایاں ہے۔

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر   زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

آبلے روتے ہیں خوں، رنج بڑا ہوتا ہے   کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے   اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ہم اسیروں کو قفس میں ذرا چین نہیں   روز دھڑکا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

میر صبا نے بھی اسی رنگ میں خوب طبع آزمائی کی ہے ؎

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں   وہ دن گزر گئے وہ زمانہ گزر گیا

دو دن کی حیات پر فلک سے   کیا کیا شکوے شکایتیں ہیں

درد و غم و یاس و داغ حرماں   ایک دل ہے ہزار آفتیں ہیں

اہلِ دولت سے کوئی نزع میں اتنا پوچھے   ساتھ کیا کیا لیا اس وقت میں کیا کیا چھوڑا

اسیر لکھنوی کے یہاں بھی یہ رنگ کثرت سے ملے گا، ملاحظہ ہو ؎

کہنے سننے کی اب نہیں طاقت عفو کیجیے کہا سنا میرا

عمر بھر تیرے گھر رہے صیاد اب کہاں جائیں ہم رہا ہو کر

دکھا رہے ہو زمانے کو تم جمال اپنا جو ہم بھی دیکھتے ہیں کیا گناہ کرتے ہیں

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

غرض یہ کہ لکھنوی شعرا کے یہاں اس رنگ کے اشعار ڈھونڈے جائیں تو بہ کثرت مل سکتے ہیں۔

باب سوم

خواجہ حیدر علی آتش شخصیت اور فن

آتش کا پورا نام خواجہ[1] حیدر علی تھا اور آتش تخلص۔ ان کے والد خواجہ علی بخش تھے جن کے آبا و اجداد بغداد سے ترک سکونت کر کے تلاش معاش کے سلسلے میں دلی آ گئے تھے اور یہیں مستقل طور پر پرانے قلعے کے قریب سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی سے فیض آباد آ گئے اور محلہ مغلپورہ میں قیام کیا۔ یہیں سنہ ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء میں خواجہ حیدر علی پیدا ہوئے۔[2]

آتش، باپ کی طرح وجیہہ، گورے چٹے، خوبصورت، کشیدہ قامت اور چھریرے بدن کے تھے۔ ابھی اچھی طرح سن بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور تعلیم و تربیت ادھوری رہ گئی چوں کہ کوئی سرپرست اور مربی نہ تھا اس لیے نوج

---

[1] خواجہ توران میں سادات کا لقب، ہندستان میں خواجہ یوسف ہمدانی یا خواجہ عبداللہ احرار کی اولاد میں جو لوگ بغداد وغیرہ سے ترکِ وطن کر کے ہندستان اور خاص طور پر کشمیر میں آباد ہو گئے ان کا لقب خواجہ تھا۔ خواجہ حیدر علی کا سلسلۂ نسب مصحفی کے بیان کی روشنی میں خواجہ عبداللہ احرار پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی لیے خواجہ نام کا جزو بن گیا ہے۔

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۳۳۸۔

کے لڑکوں اور سپاہی زادوں کی بُری صحبت میں پڑ گئے، مزاج میں بانکپن اور شورہ پشتی پیدا ہو گئی چوں کہ اس زمانے میں ہر طرف فن سپہ گری کا دور دورہ تھا، اور بانکوں اور سپاہیوں کی قدر ہوتی تھی، اس لیے انھیں بھی شمشیر زنی کا شوق پیدا ہوا، اور مغل بچوں کی صحبت میں رہ کر تیغ زنی بہت اچھی سیکھ لی تھی، بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے۔ اور کم سنی سے ہی تلوار یے مشہور ہو گئے تھے[1]۔

اس زمانے میں نواب مرزا محمد تقی ترقی فیض آباد کے مشہور رئیسوں میں تھے، وہ علم دوست، اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ ساتھ، خود بھی شاعر تھے اور فن کاروں اور شعرا کی قدر دانی بھی خوب کرتے تھے۔ آتش کے جوہر دیکھ کر نواب موصوف نے ناسخ کی طرح انھیں بھی اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب نواب مرزا محمد تقی ترقی نے فیض آباد کو خیرباد کہہ کر مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی، تو آتش بھی نواب صاحب کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں کا ماحول فیض آباد سے بالکل مختلف تھا۔ سپاہی زادوں اور بانکوں کی نہ گرما گرم صحبتیں تھیں اور نہ تلواریوں کا زور شور، اس کے بجائے گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد میں دلی سے لکھنؤ آئے ہوئے شعرا، ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ ان حالات میں آتش جب لکھنؤ پہنچے تو جرأت کے اشعار زبان پر تھے۔ انشاء اور مصحفی کے معرکے گرم تھے۔ طبیعت پوری طرح شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس دور کے اساتذہ میں مصحفی کا رنگ شاعری پسند آیا۔ اس لیے انھیں کی شاگردی اختیار کر لی۔ اور باقاعدہ مشقِ سخن کرنے لگے۔ اگرچہ علمی استعداد کم تھی مگر دھیرے دھیرے ماحول نے، بزرگوں کے فیض صحبت نے اور اپنے استاد مصحفی کی اصلاحوں نے علمی نکتوں نے بہت کچھ سکھا دیا۔ یہاں تک کہ آگے چل کر اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت استاد مانے گئے۔

نواب محمد تقی ترقی کی وفات کے بعد ناسخ تو نواب معتمد الدولہ سے منسلک ہو گئے

---

[1] تذکرہ آب بقا ص۔۹۰۔

مگر آتش نے آزاد رہنا ہی پسند کیا۔ بادشاہِ وقت کی طرف سے اسی روپے ماہانہ ملتا تھا۔ اسی میں گزر بسر کرتے تھے[1]۔ نواز گنج کے قریب جو پٹیوں سے آگے ماھو لال کی چڑھائی کے پاس اتار کو ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچا سا مکان تھا اس کو آتش نے خرید لیا تھا اور اسی میں رہتے تھے۔ شادی بھی کرلی تھی، ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام محمد علی تھا جو آگے چل کر شاعر بھی ہوا اور جوشؔ تخلص اختیار کیا۔ عمر نے زیادہ دنوں وفا نہ کی اور والد کی وفات کے بعد انھوں نے ۱۲۶۳ھ میں قضا کی۔

آتش نے شاعری کی ابتدا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کی تھی، مگر ان کا فارسی کلام کہیں دستیاب نہیں ہے۔ البتہ مختلف تذکروں میں اس کے حوالے ضرور مل جاتے ہیں مصحفی ریاض الفصحا میں ان کے فارسی کلام کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں:۔

"از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو می کرد۔ اما میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بود وآں روزہا کلام منظوم خود را بہ نظر فقیر می گزرانید و بہ رافت طبعش ازاں ظہور می داد[2]"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آتش کو فارسی سے کافی واقفیت تھی۔ آزاد کے بیان کے مطابق تو آتش نے "کافیہ کو کافی سمجھا" اور کافیہ تک کا نصاب تعلیم چوں کہ متوسط عربی داں کے لیے تھا، اس لیے اس کا مطلب یہ ہوا کہ متوسط درجے تک آتش کی تعلیم اچھی خاصی تعلیم تھی۔

مصحفی "ریاض الفصحا" میں ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

حالاں کہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ دریائے طبعش بہ جوش و خروش در زبان نظم ریختہ کہ آنہم در متانت و رزانت از غزلی فارسی کم نیست کہ بر معاصرینش سبقت بر جستن و شواری نماید۔ اگر عمرش وفا کردہ و چند سال بر ہمیں وتیرہ رفت و فکر تینش را مانعے در پیش نہ باید یکے از بے نظران

---

[1] آب حیات ص ۴۷۸۔ [2] ریاض الفصحا ص ۴۔

روزگار خواہد شد[۱]

مصحفی کے یہ ہمت افزا کلمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ آتش ابتدا سے ہی نہ صرف فن شعر گوئی کی طرف مائل تھے، بلکہ اپنی خداداد فکری صلاحیتوں کو جلا دینے کی پوری پوری کوشش میں لگے رہتے تھے اور اسی لیے اپنے معاصرین میں ممتاز بھی تھے۔

آتش کی بود و باش کے بارے میں مصنف "گل رعنا" اس طرح رقمطراز ہیں:-

"گیروا تہہ بند باندھتے تھے۔ ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا، سچے کام کا سلیم شاہی جوتا پاؤں میں، ڈنڈے میں ایک چھلہ سونے کا لگا رہتا، دوسرے تیسرے فاقے کی حالت میں، چھلہ رہن کر کے فاقہ شکنی کرتے، بھنگ پینے کا چسکہ زندگی بھر رہا۔۔۔۔۔۔ آخر زمانہ میں سعادت خاں کی سرائے میں اٹھ آئے تھے، داڑھی بھی بڑھالی تھی، اس پر مہندی کا خضاب، مگر وضع داری کی دوسری باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی رندانہ مزاج وہی فقر و فاقہ، ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے، سامنے بھج بھجا حقہ لگا رہتا تھا، کوئی امیر غریب آتا اس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش کیا جاتا۔"[۲]

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی تذکرہ آب حیات اور آب بقا کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"نواب محمد تقی خاں کے انتقال کے بعد آتش کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا، بقول آزاد توکل پر گزارہ تھا، مگر اس کے باوجود ایک گھوڑا ضرور بندھا رہتا تھا۔ سپاہیانہ و رندانہ و آزادانہ وضع رکھتے تھے کہ خاندان کا نمود بھی قائم رہے، کچھ رنگ فقیری کا بھی تھا، ساتھ اس کے بڑھاپے تک تلوار باندھ کر سپاہیانہ بانکپن نباہے جاتے تھے سر پر ایک زلف اور کبھی حیدری چٹیا، کہ یہ بھی محمد شاہی بانکوں کا

---

[۱] ریاض الفصحا ص ۱۰۷۔ [۲] گل رعنا ص ۳۶۰ مطبوعہ دار المصنفین

ملک ہے۔ اس میں ایک طرہ سبزی کا بھی لگائے رہتے تھے، اور ایک بانکی ٹوپی بھوں پر دھرے جدھر چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ زمانے نے ان کی تصاویر مضموں کی قدر ہی نہیں، پرستش کی۔ مگر انھوں نے اس کی جاہ و حشمت سے ظاہر آرائی نہ چاہی، نہ امیروں کے دربار میں جاکر غزلیں سنائیں، نہ ان کی تعریفوں میں قصیدے کہے۔"[1]

صغیر بلگرامی "جلوۂ خضر" میں محمد رضا سیاح بلگرامی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"آتش کو کبوتروں کا بہت شوق تھا، جس حجرے میں رہتے تھے اس میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا وہ بھی جھلنگا۔ بوریا کا فرش تھا اور دیواروں میں کبوتروں کے خانے جب خود آتش وہاں آکر بیٹھتے تو کبوتر اڑ کر سر اور گردن پر آ بیٹھتے، اور یہ خوش ہوتے، امیر زادے بھی آتے تو اسی بوریا پر بیٹھتے۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ نے کئی بار بلوایا مگر نہ گئے۔"[2]

خواجہ حیدر علی صوفی مشرب انسان تھے۔ بزرگوں کی روش پر درویشی اختیار کرلی تھی اور مسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام کے قائل تھے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی آتش کے مذہب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ؎

"آتش مذہباً شیعہ تھے اور اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے اپنے مذہب کے بارے میں خود کہا ہے۔

ساغر صاف مئے حب علیؓ مشرب ہے ۔۔۔ مرد مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے

آتش غم حسین میں رو ہنس رہا ہے کیا ۔۔۔ سطریں کی سطریں نامہ عصیاں سے دور ہوں"[3]

---

[1] مقدمہ کلام آتش ص ۲۳ اعظمی۔ [2] جلوۂ خضر ص ۱۰۷

[3] نگار شناسات ادیب ص ۱۰۱ د آتش کا مذہب۔ مطبوعہ نظامی پریس ۱۹۶۹ء ص ۳۴۴

خواجہ آتش آخیر عمر میں بینائی سے محروم ہوگئے تھے اور گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی، آرام کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے فکرِ سخن میں مشغول رہتے تھے بقول خواجہ عشرت اگر ملنے کوئی آتا دل چاہا تو ملتے تھے ورنہ صاف آرام کا بہانہ کر کے انکار کر دیتے تھے۔ منشی امیر اللہ تسلیم نے آخری عمر میں انھیں دیکھا تھا جب وہ معالی خاں کی سرائے میں رہتے تھے، بھنگ اور حقے کے علاوہ گھی میں تلی ہوئی مرچوں سے شوق فرمایا کرتے تھے۔[۱]

مرتضیٰ حسین فاضل خواجہ محمد بشیر کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"صفر ۱۲۶۳ھ مطابق جنوری ۱۸۴۷ء میں جب آتش کی بیماری کا شہرہ ہوا تو خواجہ محمد بشیر خواجہ رکن الدین کے ساتھ آتش کو دیکھنے گئے۔ آتش چھپر کے کچے مکان میں چارپائی پر ضعیف و نحیف پڑے تھے۔ کمزوری اور مرض کی شدت سے حالت یہ تھی کہ بولنا چاہتے تھے مگر آواز نہ نکلتی تھی کچھ دیر کے بعد دونوں حضرات واپس چلے آئے اس کے آٹھ دن کے بعد آتش نے انتقال کیا میر دوست علی خلیل نے بڑے اہتمام سے تجہیز و تکفین کے بعد گھر میں ہی دفن کیا۔"[۲]

مگر میر علی اوسط رشک نے آتش کی موت کا جو مادہ تاریخ نکالا ہے اس سے مندرجہ بالا بیان کی تردید ہوتی ہے اور یہ صاف ظاہر ہے کہ آتش کا انتقال ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ بروز چہارشنبہ صبح کے وقت ہوا تھا۔

"خواجہ دا آتش تخلص نام شان حیدر علی
صبحِ روز چہارشنبہ بود مردند را قضا
رشکِ صوری معنوی بنوشت تاریخ وفات
از محرم بست و پنجم صبح ہی ہے اربعا"[۳]

---

[۱] آبِ بقا ص ۱۳-۱۱۔ [۲] "آتش" مرتضیٰ حسین فاضل ص ۲۲
[۳] نظمِ گرامی۔ رشک ص ۴۱۸ مطبوعہ ۱۲۶۳ھ۔

رشک کے علاوہ آتش کے دیگر دوستوں اور شاگردوں نے بھی ان کی موت کے مادہ تاریخ نکالے ہیں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

"بمرد شاہ سخن"[1]۔ اشرف

۱۸۴۷ء

"لکھنؤ میں نام آتش کر گئے"[2] میر ولد حسین فوق

۱۸۴۷ء

"خواجہ حیدر علی اے وائے مرد"[3] میر علی اوسط رشک

۱۲۶۳ھ

صغیر بلگرامی نے تو آتش کی وفات پر پورا ایک قطعہ کہا ہے ؎

"نہاں شد آتش طور معانی ز چشم موسی انظار ایام
خجستہ شاعرِ عالی دماغی رواں شد سوئے خلد از دارِ آرام
صغیر از بہر سال رحلتِ او ندا زد ہاتفم" فرخندہ فرجام[4]

۱۸۴۷ء

آتش کا کلیات ان کی زندگی میں ہی ۱۲۵۶ھ میں مطبع علوی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۲۶۱ء میں خود آتش کی تصحیح کے بعد مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔۔۔۔ ایڈیشن پروفیسر مسعود حسن کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد نول کشور نے ۱۲۶۸ھ دیوان دوم کے اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد تو پھر نولکشور نے متعدد ایڈیشن وقتاً فوقتاً شائع کیے۔ یہ دونوں دواوین صرف غزلیات پر مبنی ہیں اور دونوں دیوانوں میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ ان غزلیات کے علاوہ آتش نے ۲۶ بندوں کا ایک طویل واسوخت بھی کہا ہے جو ان کے کلیات میں شامل نہیں ہے

---

[1] آتش ص ۲۲۔ [2] گل رعنا ص ۳۶۵۔ [3] نظم گرامی۔ رشک ص ۱۸۔
[4] جنرۂ خضر ص ۱۰۸۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس مکمل واسوخت کو اپنی تصنیف "مقدمہ کلامِ آتشؔ" میں شامل کیا ہے۔ آتشؔ کا یہ واسوخت ان کی عشقیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

جس طرح خواجہ آتشؔ نے اپنے اعجازِ سخن سے اپنے استاد مصحفیؔ کا نام روشن کیا اسی طرح خواجہ آتشؔ کے شاگردوں نے بھی اپنے استاد کی صحبت سے فیض یاب ہو کر وہ فنی کمال دکھایا جو آگے چل کر آتشؔ اور سلسلۂ آتشؔ کی بقائے دوام کا ضامن بنا مگر شاگردانِ آتشؔ کی مکمل فہرست تیار کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ راقم نے کافی تحقیق کے بعد تقریباً ستر ایسے شعرا کی فہرست تیار کی ہے جنھوں نے باقاعدہ آتشؔ سے اصلاح لی اور جو آتشؔ کے شاگرد کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان شعرا کی تفصیل اگلے باب میں دی جائے گی۔ آتشؔ کے ان شاگردوں میں بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے واقعی اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے واقعی کچھ کر دکھایا اور صحیح معنوں میں آتشؔ کے جانشین کہلانے کے مستحق ٹھہرے، ان میں صباؔ، رندؔ۔ شوقؔ۔ نسیمؔ۔ خلیلؔ آغا حجو شرفؔ۔ منتہیؔ۔ وغیرہ کو خاص طور پر شہرت حاصل ہے

دبستانِ لکھنؤ میں ناسخؔ و آتشؔ کی شخصیتیں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ بعض ناقدین ناسخؔ کو ہی دبستانِ لکھنؤ کا روحِ رواں قرار دیتے ہیں اور بعض خواجہ آتشؔ کو اس دبستان کا اصل رکن رکین سمجھتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک طویل بحث ہے جس پر آج تک ناقدینِ فن میں اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ میری اپنی رائے میں خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شخصیت بلاشبہ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا میں سب سے زیادہ اہم ممتاز اور باعظمت شخصیت ہے اس میں شک نہیں کہ وہ غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے، اور خدا نے انھیں گداز دل اور بلند خیال دماغ بھی ودیعت کیا تھا۔ ان کی شاعری نے انھیں وہ امتیازی حیثیت دلائی جو کسی دوسرے ہمعصر شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔

قبل اس کے کہ ہم آتشؔ کے فن اور ان کے کلام کی اہمیت کا جائزہ لیں یہ مناسب ہوگا کہ پہلے ان کے محاسن اور کمالاتِ فن اور شخصیت کے بارے میں ناقدینِ فن اور تذکرہ نگاروں کے بیانات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

خواجہ آتشؔ کے استاد غلام ہمدانی مصحفیؔ اپنے تذکرے "ریاض الفصحا" میں لکھتے ہیں۔

"خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش المتخلص بہ آتشؔ وجیہ و مہذب الاخلاق است۔ دریائے طبعش بہ جوش و خروش در زبان نظم ریختہ کہ آنہم در متانت و رزانت از غزل فارسی کم نیست کہ بر معاصرینش سبقت بردستن دشوار می نماید۔ یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد"[1]

شیفتہؔ اپنے تذکرے گلشنِ بے خار میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"آتشؔ تخلص خواجہ حیدر علی، از مشاہیر شعرائے لکھنؤ است، روش رندانہ و وضع بے باکانہ دارد مردم آں دیار آتشؔ و ناسخؔ را کہ از اساتذۂ مسلم آنجا است قریب ہم انگارند و ہر دو را ہم وزن شمارند در نکوئی طبعش سخن نیست، دیوانش ملاحظہ شد"[2]

صاحبِ "خوش معرکہ زیبا" تحریر فرماتے ہیں۔

"ناظم اقلیم سخنوری خواجہ حیدر علی آتشؔ شاگردِ رشید بلکہ قائم مقام میاں مصحفیؔ، عارف۔ کامل۔ تارک اور متوکل خواجہ صاحب سا کمیاب اور کلام معجز نظام ان کا سب انتخاب اس قدر مشہور ہے کہ اسے جمع کرنے کی حاجت نہیں۔"[3]

امداد امام اثرؔ "کاشف الحقائق" میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں کہ

"خواجہ کی فطری صلاحیت بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی .... آتشؔ بھی اکثر غزل سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو برتتے تھے ...... جہاں پر خواجہ کی شاعری نے داخلی رنگ اختیار کیا ہے وہاں اکثر اشعار ارفع درجہ کے واردات قلبیہ سے تعلق رکھتے ہیں"[4]

---

[1] تذکرہ ریاض الفصحا۔ ص ۵۔۴۔ مطبوعہ ۱۹۳۴ء انجمن ترقی اردو۔ [2] گلشن بے خار۔ ص ۷، ۱۸۷۴ء نول کشور۔ [3] خوش معرکہ زیبا ص ۳۹۹۔ [4] کاشف الحقائق دوم ص ۱۴۹۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ آتش کے کلام کی خوبیاں اس طرح گنواتے ہیں ؎

اول۔ لطفِ زبان ایسا ہے کہ کس منہ سے اس کی تعریف کیجیے۔

دوم۔ محاورہ بندی ایسی ہے کہ جواب نہیں رکھتی۔

سوم۔ اکثر اعلیٰ درجے کی مضامین بندش پاتے ہیں۔

چہارم۔ مضامین شوخی اور بانکپن سے خالی نہیں ہوتے۔

پنجم۔ اکثر مضامین فقر و فاقہ اور آزاد مزاجی کی خبر دیتے ہیں۔

ششم۔ کلام کا رنگ بہت مردانہ ہے۔ غزل گوئی کے لیے اس رنگ کی بڑی حاجت ہے۔ ورنہ اشعار میں جلالت و تمکنت کی صفتیں حاصل نہ ہوں گی۔ الغرض خواجہ صاحب میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو ایک بڑے شاعر کے لیے درکار ہیں۔ زبان کے اعتبار سے ان کی زبان شیخ صاحب کی زبان سے زیادہ دلفریب ہے، گو اصلاح زبان کی حیثیت سے شیخ صاحب کا درجہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ خواجہ صاحب کی زبان صحت لغات کے اعتبار سے شیخ صاحب کی زبان کو نہیں پہنچتی مگر خواجہ صاحب کی زبان کا حسن ایسا ہے کہ چند غلط العام شکلیں جو اُن کی بعض غزلوں میں دیکھی جاتی ہیں وہ چہرۂ زیبا میں خال کا حکم رکھتی ہیں۔[1]

مولانا عبدالسلام ندوی "شعر الہند" میں کھل کر خواجہ آتش کے فن کی تعریف کرتے ہیں، اور ناسخ کے مقابلہ میں انھیں ترجیح دیتے ہیں، اور آتش کے کلام کی خوبیوں پر حسب ذیل انداز میں روشنی ڈالتے ہیں ؎

(۱) خواجہ کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔ اشعار رواں اور بندشیں چست ہیں اور مضامین میں شوخی، رنگینی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔

(۲) اردو میں رندانہ مضامین میں خواجہ حافظ جیسا جوش اور ان کی سرمستی کا اظہار صرف خواجہ آتش ہی کی زبان سے ہوا ہے۔

---

[1] کاشف الحقائق دوم ص ۔ ۱۵۷

(۳) کلام میں فقیرانہ اور آزادانہ شان پائی جاتی ہے۔

(۴) خارجی مضامین ان کے کلام میں بھی ہیں لیکن جب وہ حلقہ ہائے گیسو سے نکل کر جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار کا آئینہ بن جاتی ہے۔

(۵) خارجی مضامین سے اگرچہ دیوان بھرا پڑا ہے مگر ان کو بھی اپنے طرزِ ادا سے دلچسپ اور لطیف بنا دیتے ہیں۔

(۶) تشبیہات میں ایک لطافت آمیز سادگی پائی جاتی ہے۔

آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں۔

"جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستور العمل ہے اور انشاپردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیئے ہیں" ان کے کلام نے پسند خاص و قبول عام کی سند حاصل کی، اور نہ فقط اپنے شاگردوں میں بلکہ بے غرض اہلِ انصاف کے نزدیک بھی مقبول اور قابلِ تعریف ہوئے۔

رام بابو سکسینہ اس طرح رقمطراز ہیں:

کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے، تصنع اور تکلف مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہِ الفاظ سے چھپایا گیا ہو۔ نہ بیجا و فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کیے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے محاورات ایسے برمحل استعمال کیے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم

---

[1] آبِ حیات ص ۳۸۰۔

ہوتی ہے......میرؔ و غالبؔ کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتشؔ ہیں.... حق یہ ہے کہ بندش کی چستی الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں آتشؔ کو ناسخؔ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔ آتشؔ کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزے دار ہوتے ہیں بخلاف ناسخؔ کے کہ ان کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے۔ آتشؔ کے اکثر اشعار نیچرل ہوتے ہیں۔ ان میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخؔ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ آتشؔ کے خیالات بہت رفیع ہیں۔ اور ان کا کیریکٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جس کی ناسخؔ کے یہاں کمی ہے صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخؔ کے آتشؔ کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ ناسخؔ کے کلام میں صرف شکوہِ الفاظ و استعارات اور تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور حلاوت آتشؔ کے یہاں ہے اس میں مطلق نہیں۔ زبان کی صحت و صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتشؔ کو ناسخؔ پر ترجیح ہے"[1]

پروفیسر آل احمد سرورؔ کی رائے آتشؔ کے بارے میں ملاحظہ فرمایئے۔

"یہ عجیب بات ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں درویشی کی روایات جنھیں مصحفیؔ شاعری کے لیے لازمی سمجھتے تھے بہت ضعیف رہیں صرف آتشؔ کے یہاں اس کی آن ملتی ہے..... آتشؔ کے یہاں جذبہ بھی ہے گرمی بھی ہے اور گداز بھی ہے وہ دربار سے اس طرح متعلق نہیں تھے جس طرح ناسخؔ تھے۔ اسی نسبت سے وہ شعریت کے قریب تھے مگر انھوں نے بھی شاعری کو نگوں کا جڑنا سمجھا اور شاعر کو مرصع ساز قرار دیا"[2]

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۲۸۵ [2] سکینہ ۵۰ لکھنؤ اور اردو ادب نگار نومبر ۱۹۴۸ء

عام طور پر ہر شاعر حالات زمانہ اور ماحول کا پروردہ ہوتا ہے لیکن شاعری میں شاعر کی اپنی ذاتی شخصیت، مخصوص افتادِ طبع اور شخصی تجربات محسوسات اور مشاہدات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف شاعری زندگی اور ماحول کی ترجمانی کرتی ہے، تو دوسری طرف شاعر کے اپنے مزاج، خیالات، نظریات، علمی صلاحیت، طرز زندگی اور لب ولہجے کی گہری چھاپ بھی اس کے کلام میں نظر آتی ہے اگرچہ ناسخ و آتش ایک ہی ماحول ایک ہی زمانہ اور ایک ہی سرزمین کی پیداوار تھے مگر دونوں کی افتادِ طبع اور شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں ایک ہی دبستان کے استاد ہوتے ہوئے بھی بہت مختلف نظر آتے ہیں اور اس کا غالباً سبب یہ تھا کہ آتش کے افتاد مزاج کو ان کی شاعری میں کافی دخل تھا جب کہ ناسخ کی شاعری ان کے افتاد سے زیادہ حالات زمانہ اور ماحول سے متاثر تھی۔

آتش کا قلندرانہ مزاج، فقر و فنا، اور قناعت و استغنا کے رنگ سے بھرپور تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی یہ تصورات صاف نظر آتے ہیں ہم جب آتش کے کلام اور ان کے اعجاز سخن کا مطالعہ ان کے افتاد مزاج اور سوانحی حالات کی روشنی میں کرتے ہیں تو ہم کو مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں۔

سلاست سادگی و صفائی آتش کے یہاں کلام میں سادگی صفائی اور شستگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ تصنّع اور تکلف نام کو بھی نہیں، بلکہ انداز بیان سادہ و پُرکار ہے اگرچہ وہ خود یہ کہہ گئے

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعری کو مرصع سازی قرار دیتے ہیں مگر دراصل ان کا اکثر و بیشتر کلام مرصع سازی اور بناوٹ سے پاک ہے[1] خود اسی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار اس نظریے کی کھلی

[1] اگر کہیں مرصع سازی کار فرما ہے تو وہ دیگر ہمعصر شعرا کی طرح کھوکھلی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)۔

ہوئی تردید کرتے ہیں:

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا ‏ شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تیری آواز کا

یہ اشارہ ہم سے ہے ان کی نگاہِ ناز کا ‏ دیکھ لو تیرِ قضا ہوتا ہے اس انداز کا

روح قالب سے جدا کرتا ہے قالب روح سے ‏ ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ تیرے ناز کا

کاٹ کر پر مطمئن صیّاد بے پروا نہ ہو ‏ روح بلبل کی ارادہ رکھتی ہے پرواز کا

آتش حسنِ الفاظ اور حسنِ بندش کا خیال ضرور رکھتے ہیں، مگر ناسخ کی طرح بھدے اور گراں الفاظ نہیں استعمال کرتے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار سلیس اور رواں ہوتے ہیں اور فوراً اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:-

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری ‏ خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

قصّۂ سلسلۂ زلف نہ کہنا بہتر ‏ پیچ در پیچ ہے خاموش ہی رہنا بہتر

حسنِ تکلیف لب بام اسے دیتا ہے ‏ شرم سمجھاتی ہے سایہ پسِ دیوار نہ ہو

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ‏ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

(باقی حاشیہ صفحہ ۵۸ کا) اور مصنوعی نہیں بلکہ فن کارانہ ہے اور آتش نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

تصوف کی چاشنی عام طور پر اردو شعرا نے تصوف کو ایک دلچسپ موضوع سمجھ کر صفِ غزل میں اس کا اظہار کیا ہے، اسی لیے ایسے شعرار کے یہاں نہ تو درد و اثر ہے اور نہ کشش۔ کچھ شعرار ایسے بھی ہیں جو عملاً صوفی تو نہ تھے مگر ان کی عملی زندگی میں تصوف کے کچھ عناصر ضرور شامل تھے، مثلاً قناعت، گوشہ نشینی، توکل، وسیع المشربی، انسان دوستی، ترکِ دنیا وغیرہ وغیرہ۔ آتش کی عملی زندگی بھی کچھ اسی قسم کی تھی اور ان کے کلام میں بھی تصوف کے یہ سارے عناصر ایک انفرادی شان کے ساتھ موجود تھے، وہ خود خانقاہ نشین صوفی تو نہ تھے، مگر گوشہ نشین فقیر ضرور تھے اور اس گوشہ نشینی میں محبوبِ حقیقی کے متعلق غور و فکر بھی کرتے تھے، مثلاً یہ اشعار:-

رہتی ہیں آنکھیں بند تصور میں یار کے ‏ ‏ ‏ ‏ تارِ نگہ سے اپنے بندھا ہے خیالِ دوست

اُلٹا اُدھر نقاب تو پردے اِدھر پڑے ‏ ‏ ‏ ‏ آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا

آتش نے اپنی شاعری کو مذاقِ عصر کی عکاسی تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اپنی جدتِ طبع اور تصوف کا سہارا لے کر، وہ معنویت پیدا کر دی، جس کی کمی کا احساس اس دور میں دبستانِ لکھنؤ میں شدت سے ہو رہا تھا، وہ اپنے کلام میں جا بجا وحدت الوجود، معرفتِ الٰہی، مقامِ حیرت، عرفانِ نفس، مظاہر خداوندی، مقامِ فنا، صفائے باطن اور عشقِ حقیقی جیسے فلسفیانہ تصورات کو بہت خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کے یہاں تصوف کی وہ تمام اصطلاحیں موجود ہیں جو عام طور پر صوفیائے کرام نے برتی ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور تحریر فرماتے ہیں:

"اس میں (آتش کی غزل میں) وحدت الوجود کے تصور کا عکس ہے، یعنی اس کے پیچھے ایک ایسا فلسفہ ملتا ہے جس میں عجم کا حسنِ طبیعت اور ہندی ذہن کی پرواز دونوں ملے جلے ہیں، مگر انصاف کی بات یہ

ہے کہ آتش کے یہاں یہ فکری میلان لکھنؤ اسکول سے تعلق کم رکھتا ہے[1]

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو　　　کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم دیکھا

آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا　　　چہرۂ شاہدِ مقصود عیاں ہے کہ جو تھا

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لیے　　　ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا　　　تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا

معرفت میں تیری ذات پاک کے　　　اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

پردۂ غفلت اٹھا پیش نظر یار ہے　　　دیر و حرم میں نہ جاؤ ڈھونڈنے موجود کو

دکھلا رہی ہے دل کی صفا دو جہاں کی سیر　　　کیا آئینہ لگا ہوا اپنے مکان میں ہے

نقشِ صورت کو مٹا کر آشنا معنی کا ہو　　　قطرہ بھی دریا ہے جو دریا سے واصل ہو گیا

دل کے آئینے میں کر جوہرِ پنہاں پیدا　　　در و دیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا

---

[1] پیش لفظ مقدمہ کلامِ آتش ص۔ ۹۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۵۹ء۔

خدا یاد آگیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے ملا بامِ حقیقت زینۂ عشقِ مجازی سے

فقیری و درویشی کے مضامین

فقیری و درویشی کو فلسفہ تصوف میں بڑا دخل ہے، تقریباً ہر صوفی شاعر کے یہاں فقر و فنا اور درویشی کے مضامین ضرور نظر آتے ہیں، دبستانِ لکھنؤ میں مصحفی پہلے شاعر تھے جنھوں نے تصوف و درویشی کو اپنے کلام میں جگہ دے کر، اسے شاعری کا ایک اہم جز قرار دیا، چوں کہ آتش کو درویشی درانت میں ملی تھی، اور آزاد منش ہونے کے ساتھ ساتھ، فقر و استغنا، اور قناعت سے خاصا لگاؤ رکھتے تھے، اس لیے ان کی شخصیت کا یہ وصف ان کی شاعری میں بھی اثر انداز ہو کر سامنے آیا، یہ ان کی اسی شخصیت کا اثر ہے کہ ان کے کلام میں فقیرانہ، اور قلندرانہ شان پائی جاتی ہے اور یہی ان کی شاعری کا تابدار پہلو ہے۔ آتش کے ہاں جذب و سلوک کے اعلیٰ مراحل نہیں ملتے بلکہ آزادہ روی، بے باکی، وخود داری، اور سرکشی نظر آتی ہے، وہ کھلے عام اپنے بوریے کو شاہی قالین پر ترجیح دیتے ہیں، اور اعلان کرتے ہیں کہ درویشی ہر لحاظ سے بادشاہت سے بالاتر ہے، مندرجہ ذیل اشعار میں ان کی بے باکی اور خود داری ملاحظہ ہو۔

مسندِ شاہی کی حسرت ہم فقیروں کو نہیں فرش ہے گھر میں ہمارے چادرِ مہتاب کا

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایا بالا بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل بادشاہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

دو نعمتیں یہ میری ہیں میں ہوں فقیر مست اک نانِ خشک اور ایک پیالہ شراب کا

کسی کو ملک دیا ہے کسی کو مال دیا فقیر ہوں، مجھے اللہ نے ہے حال دیا

اخلاقیات عموماً اخلاقیات کو تصوف کا ایک اہم جز قرار دیا جاتا ہے، آتش کے یہاں بھی ایسے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں، جن میں انھوں نے اخلاقیات کے مضامین کو نظم کیا ہے۔ مگر آتش نے اخلاقیات، اور پند و نصائح کے مضامین کو واعظانہ ڈھنگ، اور مبلغانہ رنگ میں نہیں پیش کیا ہے، بلکہ فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز بیان اپنایا ہے، اس رنگ میں آتش کہتے ہیں ؎

قناعت بھی بہار بے خزاں ہے　　شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ

سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے　　کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے

منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے　　سر شمع سا کٹایئے پر دم نہ ماریے

دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا　　ناقص ہے دوست داری میں کامل نہیں ہے تو

نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا　　خیالِ تن پرستی چھوڑ فکرِ حق پرستی کر

رندانہ مضامین رندی و سرمستی کے روایتی مضامین اردو شاعری نے فارسی سے مستعار لیے ہیں، حافظ و خیام کے رندانہ اور سرمستی کے اشعار اپنی مثال آپ ہیں۔ یوں تو اردو شعراء نے بادہ و ساغر، شراب اور شراب سے متعلق لوازمات کو محبوب ترین موضوع بنا کر خوب خوب طبع آزمائی ہے۔ خاص کر دبستانِ لکھنؤ کی شاعری تو اس قسم کے مضامین سے بھری پڑی ہے مگر آتش ایسے شخص ہیں جنھوں نے اس روایتی رنگ سے ذرا ہٹ کر اپنی راہ الگ بنائی۔ انھوں نے اپنے رندانہ مضامین میں جوش و سرمستی کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی، ان کے بیشتر اشعار کیف و نشاط میں ڈوبے ہوئے ہیں

خواجہ دردؔ کی تردامنی تو صرف فرشتوں کے وضو کرنے کا وسیلہ بنتی ہے مگر آتشؔ کا دامن نچوڑنے پر تو موجیں مارتا ہوا سمندر جنم لیتا ہے ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ دردؔ

ڈراتا ہے عبث اے شیخ تو نارِ جہنم سے
سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا　　آتشؔ

آتشؔ جب ساغر و مینا کو ہاتھ لگاتے ہیں تو نہ صرف میخانہ بلکہ سارا جہاں رقصاں نظر آتا ہے:۔

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب　　دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشۂ و پیمانہ آج

شراب لالہ گوں سے ساقیا جامِ صبوحی بھر　　شفق اپنی مجھے دکھلا رہا ہے نور کا تڑکا

ابر دریا بار آپہنچا قریبِ میکدہ　　ناخدائے کشتیِ مے ساقیِ گلفام ہو

ساقی ہے، مے ہے، یار ہے، بزمِ نشاط ہے　　چھیڑنے جواب نہ ساز کو مطرب کو چھیڑ دے

بوئے مے رکھتی ہے اس میکدے میں کیفیت　　محتسب توڑ کے شیشے کو پشیماں ہوگا

یہی نہیں بلکہ آتشؔ کا خونِ جگر بھی صہبا کی مستی سے بھرپور ہوتا ہے۔

خونِ دل اس طرح سے آنکھوں میں بھر آتا ہے
جام میں جیسے کہ صہبائے سبو آتی ہے

اور بعض اوقات تو آتشؔ کی رندی و سرمستی حافظؔ کی رندی و سرمستی کے ہم پلّہ نظر آتی ہے۔ جو رمزیت اور اشاریت، آتشؔ استعمال کرتے ہیں وہ انھیں حافظ سے اور بھی قریب تر کر دیتی ہے۔ اسی احساس کے پیشِ نظر وہ خود کہتے ہیں ؎

غزل خواجہ ہے مطلب کو پہنچ اے آتشؔ
نالۂ بے اثر مرغِ نوا سنج نہیں۔

لیکن جب ہم خواجہ حافظؔ اور آتشؔ کے کلام پر ایک ساتھ نظر ڈالتے ہیں، تو یہ حقیقت اس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے۔

ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو
مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا
آتشؔ

ساقی بنور بادہ برافروز جامِ ما
مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بہ کامِ ما
حافظؔ

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے
آتشؔ

مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست
حافظؔ

نا فہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے
آتشؔ

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجابِ خودی حافظا ازمیاں برخیز
حافظؔ

ابرِ نیساں کے کرم سے جو ریکتا لاکھوں
گوش تو کوئی سزاوارِ گہر پیدا ہو
آتشؔ

طالبِ لعل گہر نیست وگرنہ خورشید
ہم چناں در عملِ معدن و کانست کہ بود
حافظؔ

عشقیہ مضامین خواجہ آتشؔ کے یہاں غزلوں میں تغزل کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ان کے عاشقانہ رنگ کے اشعار عشق و محبت کے رموز و نکات کے آئینہ دار ہیں، وہ عشقیہ معاملات کو بہت موثر اور خوبصورت طریقے سے پیش کرتے ہیں، بقول فراق گورکھپوری، "ان کی عشقیہ شاعری میں ایک مہک اور لہک پائی جاتی ہے، وہ عشق کو ایک جان لیوا روگ بنا کر پیش نہیں کرتے ان کے

یہاں عشق زندگی کی امنگ بن کر نظر آتا ہے" اور بقول ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی :
"ان کا عشق ایک صحت مند اور صحیح الدماغ انسان کا عشق روحانی قسم کا نہیں بلکہ خالص دنیاوی قسم کا ہے اور ان کا محبوب بھی کوئی خیالی ہستی نہیں بلکہ ایک گوشت پوست کا انسان ہے ان کے یہاں چاہنے کے ساتھ ساتھ کسی کو اپنا بھی کر لینا چاہتے ہیں"

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے   دو روزہ عمر کو انسان رائیگاں نہ کرے

پاس رسوائی کا دونوں جانبوں سے شرط ہے   میں تمھیں تم مجھ کو سمجھاؤ خدا کے واسطے

کبھی کبھی آتش بھی خاص لکھنوی رنگ کے زیر اثر حلقہ ہائے گیسو کے اسیر ہو کر محض رسمی اشعار کہتے ہیں، مگر جب رہائی پا کر آزاد فضا میں پرواز کرتے ہیں، تو ان کا کچھ اور ہی رنگ سامنے آتا ہے۔ یہی وہ رنگ ہے جس میں کہ زندگی کی امنگ جھلکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں :

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری   خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

ہجر کی شب ہو چکی روز قیامت سے دراز   دوش سے نیچے نہیں اتری ابھی گیسوئے دوست

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے   دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے   میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے   ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

ہندی و بھاکھا الفاظ کا استعمال

خواجہ آتش نے اپنے کلام میں ہندی اور بھاکھا کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ اگرچہ شیخ ناسخ نے اصلاح زبان کے تحت ہندی و بھاکا کے الفاظ ترک کرنے کا حکم جاری کیا تھا مگر آتش اور ان کے تلامذہ نے اسے قبول نہ کیا، اور بدستور ہندی الفاظ استعمال کرتے رہے۔ خواجہ آتش کا یہ اقدام، ان کے ایک صحت مند اور معتدل نظریے کی نشان دہی کرتا ہے اور ان کے دیوان میں انکھڑیوں۔ کنول۔ چھاتی۔ روپ۔ روگ۔ کٹاری۔ ٹٹیاں۔ گیندے۔ پلنگ۔ گڑھنا۔ دھونی لگانا۔ دوج۔ ساون۔ جیسے ہندی۔ اور بھاکھا کے الفاظ کثرت سے نظر آتے ہیں، اور پڑھتے وقت مزہ دے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ان انکھڑیوں میں جو کندن سی سرخ ہو دیں گی۔
کہوں گا نشہ کے ڈوروں کو میں طلائے قدح

روشن نہیں ہوئے ہیں ابھی یہ کنول تمام
داغوں سے بھر چکا نہیں سینہ مرا ہنوز

رکھتا ہے ترے حسن کا گلزار عجب روپ
دکھلاتی ہے رنگینی رخسار عجب روپ

بام پر تو نے جو بچھوایا پلنگ، اے شعلہ رو
رات بھر روشن رہی بالائے کوہِ طور شمع

لطف آمیز تشبیہات

تشبیہات و استعارات شعر کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں، اور شاعر کو تشبیہہ و استعارے کے سہارے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یوں تو لکھنؤ کے سبھی شعراء نے اسے کثرت سے استعمال کیا ہے، اور اسی کثرت استعمال کے باعث لکھنؤ کی شاعری میں جار حسینہ کا عنصر پیدا

ہوگیا، جس سے کہ لکھنؤ کی شاعری بدنام ہوئی۔ دبستانِ لکھنؤ میں میر انیسؔ اور خواجہ آتشؔ کے سوا دیگر شعرا کی تشبیہیں عام طور پر کوہ کندن اور کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ خواجہ آتشؔ کی تشبیہیں صاف سادہ اور لطف آمیز ہوتی ہیں۔ ان میں زیادہ پیچیدگی اور معاملہ بندی نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں تشبیہات کی بہتات بھی نہیں ہے، بلکہ اعتدال ہے، جس سے کلام میں خاربیت کا عنصر پیدا نہیں ہونے پاتا ہے نمونے کے طور پر ذیل کے اشعار میں اس حقیقت کو سمجھا یا جا سکتا ہے ؎

میں بھی تو دیکھوں گرمی تیری اشکِ آتشیں — مشعل کی طرح سے تو میری آستیں جلا

کوچۂ یار میں سائے کی طرح رہتا ہوں — گھر کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

تکلف سے بَری ہے حسنِ ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

دل میں خیالِ حسنِ محبوب روز و شب ہے
اترا ہوا ہے یوسف مہمان سرائے تن میں

لختِ جگر کو کیوں کر مژگانِ تر سنبھالے
یہ شاخ وہ نہیں جو بارِ ثمر سنبھالے

نقش و نگار حسن بتاں کا نہ کھا فریب — مطلب سے خالی جان لے تو یہ عبارتیں

فصیح محاورات

خواجہ آتشؔ کے کلام میں روزمرہ اور محاورات کی کثرت ہے شیخ ناسخؔ نے اردو زبان کی اصلاحات کے تحت بہت سے الفاظ و محاورات کو متروک قرار دے کر ان کو نئی شکلیں دی تھیں۔ خواجہ آتشؔ نے ناسخؔ

کی اکثر و بیشتر اصلاحات کو قبول کیا ہے مگر کہیں ایسے محاورے بھی باندھے ہیں، جو ناسخ کے مروجہ اصول سے غیر فصیح تھے، اس سلسلہ میں اگرچہ آتش پر خوب خوب اعتراضات بھی ہوئے مگر انھوں نے کوئی پروا نہ کی اور بدستور ان محاورات کو فصیح قرار دے کر استعمال کرتے رہے۔ خواجہ آتش کی بعض پوری پوری غزلیں محاورات سے بھری ہوئی ہیں، مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے:

تن سے بارِ سر آمادۂ سودا اترا   شکر ہے خنجرِ قاتل کا تقاضا اترا

ورنہ محاورات کے ساتھ ان کا رنگِ سخن یہ ہے ؎

اک کان ملاحت کے ہیں پامالوں میں ہم بھی
چکھا ہے مزہ ہم نے بھی شوریدہ سری کا

کھائے گا خنجرِ جلاد کا چرکا پہلو   زخمِ پہلو کو مبارک، ہو جگر کا پہلو

عاشق تیری گلی میں بہت خاک اڑاتے ہیں   اس سرزمین کے گرد کہیں آسمان نہ ہو

کانٹا سکھا کے ہجر نے ہر چند کر دیا   وہ گل بدن ملے تو نہ پھولا سماؤں میں

دم دے انھیں بھی وہ بت ان کا بھی دل اڑا دے
زاہد کمال اپنی شیخی بگھارتے ہیں

تمثیلات اُس دور میں دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں تمثیل نگاری کا بھی کافی چرچا تھا یوں تو سب سے پہلے فارسی کے مشہور شاعر مرزا صائب نے اس پیرائے میں ہر قسم کے مضامین بیان کیے، لیکن اس کے بعد اردو کے شعرا نے بھی

اسے اپنا لیا۔ خاص کر لکھنؤ کی شاعری میں یہ رجحان بہ کثرت نظر آتا ہے، شاعر ایک مصرع میں دعویٰ پیش کرتا ہے، اور دوسرے مصرعے میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے دلیل پیش کرتا ہے، جو حقیقت پر مبنی اور قابل قبول ہوتی ہے۔ خواجہ آتش بھی تمثیل نگاری کے بڑے شائق نظر آتے ہیں۔ عام طور پر لکھنوی شعراء نے اپنی خاص افتادِ طبع کے مطابق حسن و عشق اور گل و بلبل کے بیان میں ہی تمثیلات کا استعمال کیا ہے، لیکن خواجہ آتش نے اس کے برعکس اس فن کو زیادہ تر حکیمانہ اور اخلاقی نکات کے بیان میں صرف کیا ہے۔ خواجہ آتش کی مثالی شاعری کی فنی ندرت کا اندازہ ذیل کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے ؎

ثابت قدم فقر کو ہے نفس کشی شرط
بے دیو کے مارے ہوئے رستم نہیں ہوتا

آزار سہل بھی نہیں موذی کے واسطے
دیکھا نہ گنج کو سرِ مارِ سیاہ پر

نہ دیکھا سخت طینت کو کبھی سرسبز دنیا میں
شگوفہ پھولنا ممکن نہیں دیوارِ آہن پر

رنج سے راحت نصیب طبعِ شیریں کار ہے
بار لاتا ہے قلم ہونے سے نخلِ انگور کا

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

نرمیٔ ظاہر سمجھ لے سخت گیری کی دلیل
پنبہ بھی بہرِ شرر ہم سر ہے آتش گیر کا

کلام آتش کی ان خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد مناسب ہوگا کہ ان کے کلام کے کمزور پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔ ان کے کلام میں کمزوریاں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے، کہ ان کا فنی کمال ان عیوب میں ڈوبتا نہیں اور پھر

ظاہر ہے کہ آتش کے کلام میں خامیوں کا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں۔ آتش بھی انسان ہی تھے۔ بعض اہل قلم حضرات نے تو خواجہ آتش پر سخت تنقید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خواجہ غیر محتاط اور غلط کار تھے۔ بعض حضرات نے تو ان کے غیر فصیح الفاظ، تلفظ اور استعمال کی فہرست بھی تیار کر دی جیسے مُرغ۔ عُذار تلوں۔ بیگم۔ غش۔ المضاف کفارا۔ مطابع اور خوشی بھرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم جب النّسار۔ مصحفی اور یکتا اور دیگر متقدمین کے کلام اور ان کی رایوں کی روشنی میں آتش پر کیے گئے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دراصل یہ خواجہ آتش کی ناپختہ کاری، کم علمی اور ان کی خامی نہیں، بلکہ ان کا اجتہاد ہے۔ اب میں ان اعتراضات کا ذکر کروں گا جو عام طور پر خواجہ آتش پر کیے جاتے ہیں۔

قافیہ پیمائی خواجہ آتش نے بھی کبھی کبھی ناسخ کی طرح مشکل زمینوں میں بھی طویل غزلیں کہی ہیں۔ اور اسی طوالت اور قافیہ پیمائی کے باعث ایسی ہی غزلیں اکثر بے مزہ ہیں۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ اس دور میں قافیہ پیمائی کو فن کا درجہ حاصل ہو گیا تھا، اور ایک غزل میں ہر طرح کے قافیے لانے کی کوشش علمیت اور فنی کمال کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ خواجہ آتش جن کی ناسخ سے معرکہ آرائی ہوا کرتی تھی، اس رنگ میں بھی غزل کہنے پر مجبور تھے۔ اور ناسخ کو زیر کرنے کے لیے ان کے رنگ میں بھی شعر کہنا ناگزیر تھا وہ غزلیں جن کے مطلعے ذیل میں درج ہیں خواجہ آتش کی قافیہ پیمائی کی نشان دہی کرتی ہیں۔

اس ترک کی ثنا میں جو صرفِ رقم ہوا ‏ ‏ ‏ خنجر زبان بن گئی نیزہ قلم ہوا۔ ۱۲۶ اشعار

پامال کیجیے انھیں رفتار ناز کا ‏ ‏ ‏ طاؤس و کبک رکھتے ہیں دعویٰ نیاز کا ۴۲ اشعار

وردِ زبان جنابِ محمد کا نام ہے ‏ ‏ ‏ قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے ۱۳۶ اشعار

ساقیِ ماہ رو نے پلائی شراب عشق۔ تفریح روح کو ہوئی دل شاد ہوگیا۔
۳۲ اشعار

خدا نے برقِ تجلّیٰ تجھے جمال دیا۔ ہماری آنکھوں کو دیدار کا خیال دیا۔
۲۸ اشعار

غزل جو ہم سے وہ محبوب نکتہ داں سنتا۔ زمین شعر کا افسانہ آسمان سنتا۔ ۲۸ اشعار

طریقِ عشق میں مارا پڑا جو دل بھٹکا یہی وہ راستہ ہے جس میں ہے جان کا کھٹکا
۲۷ اشعار

ادق الفاظ کا استعمال

خواجہ آتشؔ نے ناسخؔ کی طرح ادق الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مگر ایسے اشعار ان کے دیوان میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پورے کلیات سے ڈھونڈنے کے بعد دس بیس اشعار اس رنگ کے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

سرمہ کیا جو برق تجلی نے طور کو منظور تجھ کو جلوہ تھا چشمِ کحیل کا

جانبِ چرخِ مقوس آہ ہوتی ہے رواں یہ کماں ایک دن نشانہ ہے ہمارے تیر کا

اک مشتِ استخواں پہ نہ اتنا غرور کر قبریں بھری ہوئی ہیں عظامِ رمیم سے

متروک الفاظ

خواجہ آتشؔ نے متروک الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مگر ایسے الفاظ بھی بے انتہا کم نظر آتے ہیں ؂

خانہ خراب نالوں کی بل بے شرارتیں بہتی ہیں پانی ہو ہو کے سنگیں عمارتیں

اے آسماں دکھائیں گے آیا جو بام پر پیدا کیا ہے ہم نے بھی شمس و قمر کی چوٹ
پیدا کی ہے۔

اس کے کوچے میں مسیحا ہر سحر جاتا رہا	بے اجل واں ایک دو ہر رات مر جاتا رہا
مرتا رہا

درد اس کو ہو گا سن کے مری آہِ دردناک
جس دل نے کھائی ہو وے گی ترچھی نظر کی چوٹ	ہو گی

عہدِ طفل میں بھی تھا میں بسکہ سودائی مزاج
بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں

رعایت لفظی خواجہ آتش کے کلام میں رعایت لفظی اور خارجی متعلقات حسن کے مضامین بھی تلاش کے بعد دکھائی دیتے ہیں مگر ایسے اشعار کا شمار شاذ میں ہوتا ہے۔

الجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پُر شکن میں	اُگتی ہے جائے سبزہ کنگھی مرے چمن میں

ہو گئی یار کے ہاتھوں میں جو مہندی کالی	انگلیوں کو میں زبانِ گلِ سوسن سمجھا

جبی افشاں جبہ پیشانی پر اس نے چاندنی چھٹکی	ملی مسی تو آئینے میں پھولا تختہ سوسن کا

اڑایا پان کی تحریر نے اور اس کے دانتوں کو	نگین کا رنگ چمکا دے مقرر ڈاک کندن کا

لیا ہے اپنے غنچہ سے دہن میں تو نے جو اس کو	شمیم گل ہوئی ہے ریشۂ مسواک سے پیدا

ابتذال اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خواجہ آتش کے کلام میں بھی کہیں کہیں ابتذال و سوقیانہ پن کی مثالیں ملتی ہیں وہ بھی کبھی کبھی عام

لکھنوی رنگ میں رکیک اشعار کہہ جاتے ہیں۔ دراصل جہاں خواجہ بجز وصال کے معاملات، اور محبوب سے چھیڑ چھاڑ کا ذکر کرتے ہیں، وہیں لکھنؤ کا مخصوص رنگ ان پر غالب آجاتا ہے اور کلام میں ابتذال و فحاشیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے، مگر ہے۔ اس رنگ میں آتش کا رنگ سخن یہ ہے ؎

ہاتھ ملتا ہوں جو میں دیکھ کے سینے کا ابھار کہتے ہیں توڑیے جن کو یہ وہ نارنج نہیں

تا سحر میں نے شبِ وصل اسے عریاں دیکھا آسماں کو کبھی جس نے نہ بدن دکھلایا

ایسی اونچی بھی تو دیوار نہیں گھر کی ترے رات اندھیری کوئی آوے گی نہ برسات میں کیا

اس طرح خواجہ آتش کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں، کہ بلاشک و شبہ دبستان لکھنؤ کے شعرا میں خواجہ آتش کی شخصیت نمایاں اور استادی مسلم تھی۔ ان کا کلام سوز و گداز، سادگی و صفائی، فقر و تصوف قناعت و استغنا، رندی و سرمستی، واردات قلبیہ اور لطیف تشبیہات و محاورات کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جس کو ہم فخر کے ساتھ دبستانِ دلی کی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ خواجہ آتش کی شاعری دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کی شاعری کا ایک حسین سنگم ہے، ان کے مجموعہ کلام میں دونوں اسکولوں کے انفرادی رنگ کا ایک حسین امتزاج ہے جس نے کہ ان کے انداز شاعری کو اور مقبول بنایا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے

"آتش کا رنگ ان کا اپنا رنگ ہوتے ہوئے بھی مختلف رنگوں کا مجموعہ تھا سودا کی واہ درد کا تصوف اور متانت میر کی آہ جرأت کی معاملہ بندی اور خود آتش کی رندی و سرمستی کا مجموعہ تھا"[1]

---

[1] جلال ڈاکٹر محمد حسن ص ۶۳

دراصل خواجہ آتش کا یہی انفرادی رنگ جو کہ لکھنؤ اور دلی کے ملے جلے رنگوں سے وجود میں آیا تھا پیش خیمہ تھا اس انداز شاعری کا جو کہ آگے چل کر جلال داغ امیر وغیرہ کے ہاں نکھر کر سامنے آیا اور خود خواجہ آتش کے شاگردوں نے اپنے استاد کے رنگِ شاعری کو نہ صرف اپنایا اور سختی سے اس کی پابندی کی بلکہ اس میں مزید رنگ آمیزی کر کے اس کے آب و رنگ کو اور نمایاں کر دیا جس سے کہ خواجہ آتش کے انداز شاعری کے اثرات ان کے تلامذہ کی وساطت سے رفتہ رفتہ دیگر ہمعصر شعرا پر پڑنے لگے۔ اگرچہ ناسخ کے شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اس کے باوجود آگے چل کر آتش کا رنگ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا پر اس قدر گہرا ہو گیا، کہ نہ صرف دیگر ہمعصر شعرا آتش کے رنگ میں رنگ گئے بلکہ خود تلامذہ ناسخ کا رنگ شاعری بھی کافی حد تک ناسخ سے مختلف ہو گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خواجہ آتش کی شاعرانہ شخصیت نے جو ورثہ چھوڑا تھا، اس سے ان کے شاگردوں اور آنے والی نسلوں نے کس حد تک فیض اٹھایا، اور کس حد تک اثرات قبول کیے۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے، خود خواجہ آتش کے شاگردوں کا اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کا مطالعہ بے انتہا ضروری ہے، جس کو آئندہ صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

باب چہارم

تلامذہ آتش سوانح اور کلام

آزاد

شاہ[1] میرزا نام آزاد تخلص تھا۔ باپ کا نام سلطان میرزا تھا۔ رئیس کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ فن شعر و سخن میں حضرت آتش سے اصلاح لیتے تھے[1] بہت کوشش کے باوجود اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ آغا ہجو شرف نے اپنی منظوم تصنیف "افسانہ لکھنؤ" میں آزاد کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

سنو شاہ مرزا بہادر کا حال ۔۔۔ مزیّب ہے شان و شکوہ و جلال

نہیں ان کا شعر و سخن میں جواب ۔۔۔ مضامین جو ہیں وہ ہیں انتخاب

تخلص ہے آزاد خود ہیں اسیر ۔۔۔ نہیں ان کا جود و کرم میں نظیر

طلب گر کیا کوئی پایا نہیں ۔۔۔ کبھی کوئی محروم آیا نہیں

یہ ہے شہریار اور مرزا کا حال ۔۔۔ جبیں سے نمایاں ہے جاہ و جلال

اس سے ان کے جود و عطا اور شعری کمال پر روشنی پڑتی ہے، لیکن نہ تو ان کا کلام حاصل ہوا ہے اور نہ ان کے بارے میں مزید روشنی پڑتی ہے۔ البتہ خوش معرکہ زیبا[1] میں ان کی دو غزلیں ملتی ہیں وہ ان کے رنگِ سخن کے تعارف کے لیے کافی ہیں

---

[1] خوش معرکہ زیبا ص ۵۴۴۔

وہ غزلیں حسب ذیل ہیں۔

ہم کو بھی دھیان ہجر میں کیا کیا لگا رہا
تم کو اگر خیال ہمارا لگا رہا

قاتل تو ایک وار میں دو ٹکڑے کر چکیں
فرق آیا بانکپن میں جو تسما لگا رہا

شب بھر جگایا وعدے نے اس شوخ کے مجھے
اب آئے گا وہ بس یہی کھٹکا لگا رہا

تنہا گیا جو سیر کو آموں کے باغ میں
اشکوں کا دونوں آنکھوں سے ٹپکا لگا رہا

مدت کے بعد آج میرے ہاتھ لگ گئے
برسوں تمھاری گھات میں بندا لگا رہا

مشتاق دید سیکڑوں آئے چلے گئے
دن رات کوئے یار میں میلا لگا رہا

حالِ شبِ فراق نہ کچھ مجھ سے پوچھیں آپ
آزاد کو خیال تمھارا لگا رہا

ناز کے طور اور انداز سخن کے بدلے
مجھ سے تیور رہیں کچھ اس غنچہ دہن کے بدلے

اس سے بہتر نہیں کچھ ہجر میں شغل اے دل زار
نالہ و آہ رہے شعر و سخن کے بدلے

یار کے سونے میں کیا خوب بن آئی اپنی
ہم نے چھلے کئی اس رشکِ چمن کے بدلے

ناوک افگن کوئی مل جائے الٰہی ایسا
آہوئے دل کو کرے صید ہرن کے بدلے

عیش میرا نہ کبھی دیکھ سکا پیرِ فلک
رنگ چنبر کی طرح چرخِ کہن کے بدلے

ان دنوں صدقے میں اس غنچہ دہن کے آزاد
بلبلیں چھوٹتی ہیں زاغ و زغن کے بدلے

اصغر

نواب اصغر علی خاں نام، اصغر تخلص تھا۔ باپ کا نام مولوی علی اکبر تھا۔ یہ کشمیری تھے۔[1] اصغر بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے وزیر تھے۔ انھیں بہادر شاہ کی سرکار سے ظفرالدولہ

---

[1] سخن شعرا ص ۳۲

معتبر الملک رفیع الامراء کا خطاب بھی ملا۔ ان پر بادشاہ دہلی کی خاص توجہ تھی۔ یہ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے داماد تھے[1] اور نواب شرف الدولہ (بادشاہ لکھنؤ کے عزیزوں میں تھے[2]) اصغر لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی[3]۔ کلکتہ میں بھی بہت دنوں تک قیام کیا۔ پیدائش کی صحیح تاریخ نہ معلوم ہو سکی۔ ۱۲۷۶ھ[4] میں انتقال کیا۔ صاحب سخن شعرا نے جو کہ اصغر کے دوستوں میں تھے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی ہے ؎

قطعہ تاریخ انتقال

جوں علی اصغر شد از دنیا سوئے ملکِ عدم　　شد دلِ نسّاخ محزوں راز بس رنج و الم

شد بیک مصرع دو تاریخ ایں چنیں اے جانِ زار　　"شنبہ ذی قعدہ ۵ ہے ہے" "آہ درد و ہائے غم"

۱۲۷۶ھ　　۱۲۷۶ھ

دیگر

قضا کی جو علی اصغر نے اے نسّاخ　　غمیں ہے یہ دلِ مانوس صد حیف آج

کہی ہے آہ میں نے عیسوی تاریخ　　علی اصغر موئے افسوس صد حیف آج

۱۸۶۰ء

اصغر اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے[5]۔ آتش کے حضور میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ایک مثنوی اور ایک دیوان کے مصنف تھے[6]۔ اگرچہ راقم کو نہ تو مثنوی ہی دستیاب ہوئی اور نہ دیوان۔ مختلف تذکروں میں جو اشعار مل سکے ہیں وہی نمونے کے طور پر درج ذیل ہیں۔

پتا نہ کوچۂ گیسو میں ہے نہ پہلو میں　　تمھیں بتاؤ مجھے پھر کہاں ہے دل میرا

نہیں دیر و حرم سے کام ہم الفت کے بندے ہیں　　وہی کعبہ ہے اپنا آرزو دل کی جہاں نکلے

---

[1] سخن شعرا، ص ۳۳۔ [2] دیوان غریب ص ۲۶۔ [3] سخن شعرا ص ۳۳۔ [4] نسّاخ [5] بزم سخن ص ۱۴۔ [6] سخن شعرا ص ۳۳۔

وہ رند ہوں مجھے دستِ سبو سے بیعت ہے
مریدِ حضرتِ پیرِ مغاں ہے دل میرا

خدا کو مان نصیحت سے باز آ ناصح!
ابھی تو نام خدا نوجوان ہے دِل میرا

ہوئے ہیں خون کے پیاسے جو آشنا میرے
انھیں شفیقوں میں اک مہرباں ہے دل میرا

جنوں انگیز پھر فصلِ بہارِ عاشقی آئی
دلِ سودا زدہ پھر رنگ لایا وائے رسوائی

یہ کس پردہ نشیں نے جھانک کر شکل اپنی دکھلائی
بنی ہے روزنِ دیوار جو چشمِ تماشائی

نہ کھینچا ہاتھ ترکِ چشم نے جورِ غریباں سے
ہزاروں بار سمجھانے سے پردے میں حیا آئی

دہانِ چشم نے کس کے کیا خاموش و نابینا
نہ غنچے میں ہے گویائی نہ نرگس میں ہے بینائی

بجا ہے اضطرابِ روح وقتِ نزع اے اصغر
کہا ہے یادِ حاکم نے بلانے کو قضا آئی

تشنہ لب ہوں مے سر جوش پلا دے ساقی
لبِ ساغر کو مرے لب سے ملا دے ساقی

سر جھکاتا ہوں ترے پاؤں پہ بس دیر نہ کر
گردنِ شیشہ مری سمت جھکا دے ساقی

یاد میں رندوں کی ہوتی ہے بری کیفیت
نام پر جم کے بھی اک جام لنڈھا دے ساقی

ایک چلّو مجھے دے ڈال بھلا جام کی خیر
برکت تیرے خمِ مے میں خدا دے ساقی

مے گل رنگ کو بھر شیشے میں خم خالی کر
دخترِ رز کو پری زاد بنا دے ساقی

باغ ہے، ابر ہے اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے
مے کو جی چاہتا ہے کیا ہیں ارادے ساقی

قلزمِ بادۂ عصیاں میں یہ طوفانی ہے
کشتیٔ جرم مری پار لگا دے ساقی

مر گیا ہوں المِ فرقتِ مے خانہ میں
پائے خُم تھوڑی سی اب قبر کی جا دے ساقی

دخترِ رز کی محبت میں ہوا دیوانہ
موجِ مے کی مجھے زنجیر پنہا دے ساقی

ایک دم بھی جو بخود آؤں تو دے ساغرِ مے
خود فراموشی مجھے یاد دلا دے ساقی

ہوش اصغر کے اڑے طاق سے شیشوں کو اتار
ایک جھگڑا اسے پریوں کا دکھا دے ساقی

اعظمؔ

میرزا اعظم شاہ اعظمؔ، میرزا محمد اشرف ابن خلیفہ عبدالکریم کے بیٹے تھے۔[1] ان کے آبا و اجداد ترکستان سے ترک وطن کر کے دہلی آئے اور وہیں مقیم ہوگئے۔[2] کچھ دنوں تک دہلی میں قیام کرنے کے بعد اعظمؔ لکھنؤ چلے آئے اور نواب امین الدولہ کی سرکار میں نوکری کر لی۔[3] فن شعر و سخن میں آتشؔ کے شاگرد ہوئے۔[4] سال پیدائش اور سال وفات کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ ان کا کوئی دیوان بھی نظر سے نہیں گزرا۔ چند اشعار تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں مل جاتے ہیں۔ ان دستیاب شدہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے رکاکت اور ابتذال سے پرہیز کیا ہے خیال کی بلندی اور نزاکت کا خاص خیال رکھا ہے۔ زبان کی سلاست ہر شعر سے عیاں ہے۔ نمونے کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عالم مطیع ابروئے خم دار نے کیا	قبضہ جہاں میں تیری تلوار نے کیا
آزردہ دل کو رات کی تکرار نے کیا	بے لطف کیا مجھے تیری تکرار نے کیا
ناکارہ جنس وہ تھا بازار دہر میں	افسوس مجھ کو لے کے خریدار نے کیا

دیکھا تو خاکسار کا رتبہ بلند ہے	دریا ہے پست ساحلِ دریا بلند ہے

پامال ہوئی ہر کسی مغرور کی مٹی	قدموں کے تلے ہے سر فغفور کی مٹی
بو سونگھتے ہی اس کی کہا میں نے انا الحق	یہ عطر ہے جس کا وہ تھی منصور کی مٹی

---

[1] تذکرۂ سخن شعرا ص ۳۶۔ [2] تذکرۂ سراپا سخن ص ۲۶۰۔ [3] سراپا سخن ص ۲۶۰۔ [4] جوش معرکہ زیبا ص ۶۲۴۔

دو ہیں طریق کافر و دیں دار کے لیے
رشتہ ہے ایک سُبحہ و زنّار کے لیے

آب رواں کی پگڑی جو بندھوائیے کبھی
چوری حباب ہو تیری دستار کے لیے

افشاں ضرور چاہیے گیسوئے یار کے
ہو چیتیاں سفید و سیہ مار کے لیے

کیوں کر نہ اس کو تیغ سے تشبیہ دیجیے
ابرو سے کام یار نے تلوار کے لیے

گیسوئے مشکیں سدا رہتے ہیں اس کے کان تک
آگے بابنی سے نہیں بڑھتا یہ جوڑا سانپ کا

دامن تک اس کے ہاتھ نہ پہنچا ہزار حیف
نکلا نہ حوصلہ مرے دل کی امنگ کا

ابرو کماں ہے، تیغ نگہ، تیر ہے مژہ
سب اس کے پاس لیس ہے سامان جنگ کا

داغوں کو میرے مرہم زنگار چاہیے
اعظمؔ میں سوختہ ہوں کسی سبزہ رنگ کا

بڑھائی منہ لگا کر یار نے توقیر شیشے کی
نہ کیوں رشک آئے مجھ کو ہاری تقدیر شیشے کی

واعظ کرے گا کیوں نہ مذمت شراب کی
اندھے کے آگے قدر نہیں آفتاب کی

مستغنی دو جہاں سے ہوں کیا مجھ کو چاہیے
تو ہے بغل میں ہاتھ میں بوتل شراب کی

اعظمؔ فشار قبر سے کچھ مجھ کو غم نہیں
ایمان میرا دوستی ہے بو تراب کی

منکر وہ ہوں گے حشر میں کیا قتل سے مرے
محضر ہمارے خون کا خطّ جبیں ہوا

جو ایک سے دبا وہ دبا دوسرے سے بھی
زیر فلک جو آیا وہ زیر زمیں ہوا

اعظمؔ

میرزا اعظم علی نام، اعظمؔ تخلص تھا۔ منشی محمد رضا کے بیٹے اور الہ آباد کے رہنے والے تھے۔[1] عرصے تک آگرہ کی عدالت میں ملازم رہے۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی وطن الہ آباد چلے آئے[2] اور پھر آخر دم تک یہیں قیام کیا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔[3] سال وفات صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا۔ مصنّف تذکرۂ شعر و سخن[4] کا بیان ہے کہ سنہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء میں بقید حیات تھے اور ستر سال کی عمر تھی۔[5] اعظمؔ کا دیوان پہلی بار آگرے میں ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسری بار مطبع نور الابصار نے ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء میں شائع کیا۔ دونوں ہی ایڈیشن اب بالکل نایاب ہیں۔

شعر و شاعری میں اعظمؔ نے خواجہ آتشؔ سے اصلاح لی۔ آتشؔ کی وفات کے بعد خود استاد ہو گئے اور بہت سے شعراء نے ان کی شاگردی قبول کی۔ ان کے شاگردوں میں مرزا احمد بیگ مشفقؔ، منشی محمد جان خاں حیرتؔ، شاہ محمد علیم الدین علیمؔ، مرزا سجاد حسین سجادؔ، مرزا سردار حسین سعیدؔ، حسن رضا خاں فخرؔ، شیخ عبد الحلیم بسملؔ اور شیخ عبد الاحد صاحب زمین دار کے نام سر فہرست ہیں۔

انھوں نے بھی اپنے استاد کی طرح فقر و فنا اور تصوف کے مضامین کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ تصنع اور تکلف سے پرہیز کیا ہے۔ لفظی صناعی کے بجائے کلام کی اثر آفرینی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ سلاست زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کی بلندی ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زخم کاری لگا تو چوم لیا　　　قبضہ خنجر کا، ہاتھ قاتل کا

---

[1] جواہر سخن ص ۵۹۲۔ [2] خم خانہ جاوید جلد اول ص ۳۳۸۔ [3] ایضاً۔ [4] نیاز علی پریشاںؔ
[5] تذکرہ شعر و سخن ص ۱۲۹۔

• کوئی کر سکا دل نہ اپنا لہو　　میرا ساتھ برگِ حنا نے دیا

ساقی نے دیا جام مئے بے خبری کا　　اب ہوش ہے شیشے کا نہ شیشے کی پری کا

خیالِ جاناں میں جان دینا، خیالِ حسنِ حسیں میں جینا
انھیں سے رغبت، انھیں سے الفت، انھیں پہ مرنا انھیں میں جینا
گدا کی مرگ و حیات دونوں الگ ہیں دنیا کے دغدغے سے
نہ فکرِ طبل و علم میں مرنا، نہ شوقِ تاج و نگیں میں جینا

لیلےٰ کو کھولنے دو ذرا گیسوئے دراز　　مجنوں کے بند بند میں زنجیر دیکھنا

فارغ البال کیا بے سروسامانی نے　　مالِ دنیا نہ رہا چور کا کھٹکا نہ رہا

ہمیں کو ان کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں　　وگرنہ واں کوئی پردہ نہیں حجاب نہیں

کوئی محل میں نہیں ہے پس پردہ ہم ہیں　　برملا قیس کو دعویٰ ہے کہ لیلا ہم ہیں

خوشی دیکھتے ہیں محل دیکھتے ہیں　　تماشائے چرخِ کہن دیکھتے ہیں

عیش و راحت کا بھی اسباب مہیا ہوگا　　سر سے بارِ غم و آلام تو ٹل جانے دو
روک لیوے گا اسے رو کنے والا دل پر　　ناوکِ غمزۂ خوں ریز بھی چل جانے دو

کعبے کو نہ چھوڑیں گے نہ ہم دیر کے در کو　　اک روز ادھر جائیں گے اک روز ادھر کو

سرپنچ کے اعظمؔ نے خریدا ہے غمِ عشق — دل دے کے مری جان یہ آزار لیا ہے

تو وہ بت ہے کہ تری جلوہ نمائی کے لیے — آرزو خانۂ کعبہ میں مسلماں کرتے

حوصلہ دنیا کا زر کے ساتھ ہے — طاقتِ پرواز پر کے ساتھ ہے

جھونکے نسیمِ فکر کے کنعان تلک گئے — بوئے گلِ مراد سے کوچے مہک گئے

افضلؔ

منشی حسن یار خاں نام، افضلؔ تخلص تھا۔ ان کے والد باقر علی خاں امرائے لکھنؤ میں سے تھے۔ دادا کا نام محمد یار خاں تھا۔ جو سرکارِ اودھ میں رسالدار تھے[1]۔ افضلؔ واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کے دورِ حکومت میں بخشی گری کے عہدے پر مامور ہوئے۔ انھیں سرکار سے اسعد الدولہ کا خطاب بھی ملا۔ یہ واجد علی شاہ کے بہی خواہوں میں تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب اودھ کی بساط الٹ گئی[2]، اور شاہِ اودھ کو مٹیا برج جانا پڑا، تو یہ بھی ضعیف ہونے کے باوجود بادشاہ کے ساتھ ترکِ وطن کر کے کلکتے پہنچ گئے، اور آخر دم تک وہیں رہے، اور وہیں انتقال کیا۔ مصنفؔ انسانہ لکھنؤ[2] نے افضلؔ کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

یہ ہے جو حسن یار خاں باریاب — کہ ہے اسعد الدولہ ان کا خطاب
ضعیفی میں لشکر کے ہمراہ ہیں — یہ منشی قدیمی ہوا خواہ ہیں

---

۱ دیوان غریب ص ۳۴۹ ۔ ۲ آغا جو شرف

یہ آتش کے شاگردوں میں ہیں قدیم | تخلص ہے افضل عائد ندیم
مدرس نمودی دکامی یہ ہیں | بڑے شاعروں میں ہیں نامی یہ ہیں
رفاقت کے حق کو ادا کر گئے | سنا ہے کہ کلکتے میں مر گئے[1]

بقول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی[2] "افسانۂ لکھنؤ" کا سال تصنیف ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۳ء سے قبل افضل کا انتقال ہو چکا تھا۔ سال پیدائش اور سالِ وفات صحیح طور پر دریافت نہ ہو سکا۔ اردو شعر و سخن میں حضرت آتش سے اصلاح لیتے تھے کلام میں وہی آتش کا سا بانکپن اور رکھ رکھاؤ ہے۔ دستیاب شدہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ ابتذال سے پرہیز کیا ہے اور کلام میں ایک خاص قسم کی روانی ہے۔

اگرچہ افضل صاحبِ دیوان تھے۔ مگر بے انتہا تلاش کے باوجود آج تک دیوان نظر نہیں آیا۔ مصنف سخن شعرا[3] کا بیان ہے کہ انھوں نے دیوان دیکھا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

وہ دیوانہ ہوں جس پر رشک فرزانوں کو آتا ہے
فسانہ ہے پرستاں میں مری زنجیر کے غل کا

دل ہے دیوانہ الٰہی کس پری تمثال کا | ہوش اڑا دیتا ہے افسانہ ہمارے حال کا

چھری گردن پہ اپنی پھیر لوں گا اپنے ہاتھوں سے | نہ مجھ سے رنج دیکھا جائے گا بازوئے قاتل کا

رات نکلا تھا چمک کر مہ تاباں کیسا | تجھ کو دیکھا تو ہوا پھر وہ پشیماں کیسا

---

[1] افسانۂ لکھنؤ۔ [2] نیا دور اگست ۵۷ء ص ۴۶۔
[3] نساخ ص ۴۱۔

وحشتِ دل کا تقاضا ہے کہ چل صحرا کو ‏— ناتوانی مجھے کہتی ہے بیاباں کیسا
دل کو گیسوئے پریشان سے ہوا عشق افضلؔ ‏— نظر آتا ہے مجھے خوابِ پریشاں کیسا

چشمِ بیمار کا نہ ہو بیمار ‏— تندرستی ہزار نعمت ہے

مرنے کے بعد قدر ہوئی اپنی یار کو ‏— سچ کہتے ہیں کہ خلق بھی مردہ پسند ہے

افکارؔ

صاحب زادہ اصغر علی خاں نام اور افکارؔ تخلص تھا۔ صاحب زادہ احمد یار خاں ہبرؔ کے بیٹے تھے[1]۔ خاندانی شاعر تھے۔ مذاقِ شعر و سخن ورثے میں پایا تھا۔ سالِ پیدائش و وفات کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ بقولِ مصنّف خمخانۂ جاوید[2] ترتیب تذکرۂ انتخاب یادگار (۱۸۸۰ء) کے وقت ۵۸ سال کی عمر تھی[3]۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ فنِ سخن میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ آتشؔ کے علاوہ غفلتؔ، ذوقؔ اور علی بخش بیمارؔ سے بھی استفادہ کیا ہے[4]۔ افکارؔ کا کلام باوجود سعی کے دست یاب نہ ہو سکا۔ چند اشعار تذکرۂ خمخانۂ جاوید جلد اوّل میں مل جاتے ہیں۔ ان اشعار سے موصوف کی مضمون آفرینی اور رنگین مزاجی عیاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

ذکرِ محشر ہو چکا واعظ ذرا اب دل سنبھال ‏— میں بیاں کرتا ہوں اپنے فتنہ گر کی چال کا

دے دیا طاق سے آئینہ اٹھا کر ان کو ‏— حال مجھ سے دلِ حیراں کا دکھایا نہ گیا

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۱۶۸۔ [2] و [3] و [4] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۳۶۸

تم تو محشر ہیں نہ ہو گے کہہ دو ‌ ‌ ‌ ‌ ورنہ ایک اور قیامت ہو گی

قد ہی خود قیامت تھا زلف کیوں بڑھائی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ اور ساتھ محشر کے اک بلا لگائی ہے

اوجؔ

مرزا علی حسین نام، اوجؔ تخلص تھا۔ مرزا عسکری منجم کے لڑکے تھے[۱]۔ فن سخن میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[۲] سالِ پیدائش اور سالِ وفات کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں، ان کے آبا و اجداد لکھنؤ ہی کے رہنے والے تھے۔ خود اوجؔ کی بھی پوری عمر یہیں گزری[۳]۔

مصنف سخنِ شعرا کا بیان ہے کہ اوجؔ صاحب دیوان تھے[۴]۔ مگر راقم کو کہیں بھی ان کا دیوان نہیں نظر آیا۔ چند اشعار خوش معرکۂ زیبا میں مل جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے۔

زاہد بناؤں میں بخدا سجدہ گہ اُسے ‌ ‌ ‌ ‌ اپنے صنم کا مجھ کو اگر سنگ پا ملے

بالیدگیٔ دل ہوئی سوز و گداز سے ‌ ‌ ‌ ‌ جو سوں جو ہونٹ لذت آب بقا ملے
ایسی تیرے فراق میں صورت بدل گئی ‌ ‌ ‌ ‌ بیگانہ وار مجھ سے مرے آشنا ملے

نہ گئی داغ زلیخا کی سیاہی اب تک ‌ ‌ ‌ ‌ چشم یعقوب ہوئی اے مہ کنعان روشن

۱؎ سخن شعرا، ص ۵۷۔ ۲؎ دیوان غریب ص ۳۱۔ ۳؎ خوش معرکہ زیبا ص ۳۴
۴؎ سخن شعرا، ص ۵۷۔

ہوں صیدِ محبت مجھے نخچیر نہ کہنا　　زخمی ہوں نگہ کا ہدفِ تیر نہ کہنا

چاہیے جوشِ جنوں میں مجھے دوہری زنجیر　　گیسوئے یار ہیں سرمایۂ سودا دونوں

دلِ ویراں ہو مگر تیرے کرم سے آباد　　اس خرابے کے لیے صورتِ تعمیر نہیں

دامنِ پیراہنِ یوسف قبا کیا ہو گیا　　چاک گویا پردۂ رازِ زلیخا ہو گیا۔

ہوشیاری سے نہیں کم غفلتِ عشاق بھی　　مثلِ بیداری عیاں خوابِ زلیخا ہو گیا

نسبت اس کو نہیں کچھ تیری بیاضِ رخ سے　　اے صنم حسنِ مہِ مصر کا دفتر دیکھا

رخ تیرے ستم کرتے ہیں گیسو سے زیادہ　　ظالم یہ مسلماں ہیں ہندو سے زیادہ

مارا جو ان آنکھوں نے تو ہونٹوں نے جلایا　　اعجاز کا ہے مرتبہ جادو سے زیادہ

بسملؔ

میرزا عنایت علی نام اور بسملؔ تخلص تھا۔ والد کا نام میرزا سعادت علی تھا[1] فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ مگر زیادہ تر بنارس میں قیام رہتا تھا سالِ وفات اور سالِ پیدائش کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ فن شعر و سخن میں حضرت آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[2]۔ شاگردانِ آتشؔ میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اور

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد اول ص ۵۸۱۔ [2] تذکرۂ رشک چمن ص ۲۲۔

صاحبِ دیوان بھی تھے[۱]۔ مگر انتہائی جستجو کے باوجود دیوان نہ مل سکا۔ کچھ اشعار تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں اور چند اشعار خم خانۂ جاوید جلد اول میں مل جاتے ہیں دست یاب شدہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد کی طرح ان کو بھی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ سلاستِ بیان کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ کلام کی اثر آفرینی پر زیادہ توجہ رہتی تھی۔ تصوف اور اخلاق کے مضامین کو بھی اپنے کلام میں بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بسملؔ کے شاگردوں میں ولی محمد ولیؔ نے شہرت حاصل کی[۲]۔ رنگ یہ ہے۔

تجلی سے اپنی وہ پنہاں ہے مجھ سے　　کوئی درمیاں ورنہ پردہ نہیں ہے

مومن و کافر کا مرجع کوئے جانانہ رہا　　شیخ کا کعبہ، برہمن کا صنم خانہ رہا

کیجیے کیوں کر نہ ساقی سے گلہ اس بات کا　　خم بھرے غیروں کو خالی اپنا پیمانہ رہا

مختلف احوال دنیا کا ہے ہر شام و سحر　　شب کو آبادی سرا میں دن کو ویرانہ رہا

دولت سرائے یار کی تعریف کیا کروں　　یہ گھر بنا ہے سیکڑوں ہو کر مکاں خراب

تجلّیؔ

للّی جی نام، تجلیؔ تخلص تھا۔ شعر و سخن میں حضرت آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[۳]۔ مصنّف تذکرۂ شعرائے سخن کا بیان ہے کہ تجلی مینڈو لال زارؔ کے شاگرد تھے[۴]۔ مگر راقم

۱؎ خم خانہ جاوید جلد اول ص ۵۸۱۔ ۲؎ یادگار ضیغم۔ ۳؎ رسالہ انوار الاخبار مجموعہ گلدستہ شعراء ۱۸۷۷ء ص ۵۶۔ ۴؎ تذکرۂ ہندو شعراء ص ۸۰۔

کی رائے میں رسالالانوار الاخبار کو ترجیح حاصل ہے۔ تجلّی اردو و فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کی ایک فارسی غزل اسی گلدستۂ شعرا میں موجود ہے۔ اردو کی بھی چند غزلیں اسی مجموعے میں دستیاب ہوئی ہیں۔

ان کا کلام بلند جذبات اور شاعرانہ تخیّل کی بہترین مثال ہے۔ محاورات بہت منتخب اور برمحل استعمال کرتے تھے۔ اپنے استاد کی طرح سلاستِ بیان کا خاص طور پر خیال رکھا ہے:۔ رنگِ سخن ملاحظہ ہو۔

خطِ مشکیں و چہرۂ رنگیں　　　ملکِ تاتار و باغ کشمیر است
دلِ من تازہ می شود از درد　　　آہ ایں نالۂ کہ دل گیر است

گو طرحدار نظر آئے حسین مجھ کو بہت　　　میں سوا تیرے کسی اور پہ مفتوں نہ ہوا

وصلِ گل رو کا صبا لاتی ہے کیا اے دل پیام　　　آج تو پھولا سماتا پیرہن میں کیوں نہیں

جان بچنے کی نہیں، ہیں وہ بلا کے کالے　　　چھونا مشّاطہ ذرا خوب سمجھ کر گیسو
بے نمک ان کے نہ ہونے سے ہے روئے مہتاب　　　سچ اگر کہیے تو ہیں حسن کے زیور گیسو

کسی کروٹ کسی پہلو نہیں دم بھر قرار آتا　　　ٹپکتا سر کو ہوں میں ہجر میں دیوار و در سے

شمیم زلفِ پیچاں سے معطر ہے دماغ اپنا　　　کہیں بہتر ہے خوشبو بھینی بھینی مشک و عنبر سے
نہیں خوش آتی ہم کو تیری اے زاہد یہ ہٹ دھرمی　　　محبت سنگِ اسود سے بغاوت سنگِ مرمر سے

مختار ہے وہ چاہے مجھے دیکھے نہ دیکھے　　　آنکھ اپنی تو اس رونقِ محفل سے لگی ہے

ثناؔ

ثناء اللہ خاں نام اور ثناؔ تخلص تھا۔ والد کا نام منور خاں تھا۔ بھیکم پورہ ضلع فرخ آباد کے رہنے والے تھے[1]۔ فن سخن میں حضرت آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[2]۔ حکیم قطب الدین باطنؔ کا بیان ہے کہ علی گڑھ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی[3]۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں اور کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ نہ ان کا کلام دستیاب ہو سکا۔ چند اشعار تذکرۂ گلستان بے خزاں میں ملتے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

خود آرائی میں بھی دیکھو ستم ایجادیِ ظالم ٭ پڑا موباف بھی تو اطلسِ چرخِ جفا جو کا

یہ گولیوں کی تفنگِ نگہ نے کی بوچھار ٭ کہ بن گیا ہدف چرخ چاند تارے رات

تھا جس سے شامِ شبِ قدر صبح عید کو رشک ٭ وہ دن کدھر گئے یارب کدھر سدھاری رات

کیا ثناؔ شعر لکھیں دستِ فلاکت کے سبب ٭ سر کو پا باندھتے ہیں پاؤں کو پر باندھتے ہیں

جلیلؔ

میر ہدایت علی نام، جلیلؔ تخلص تھا۔ پہلے ہدایتؔ تخلص کرتے تھے۔ جب میر دوست علی نے اپنا تخلص جلیلؔ اختیار کیا، تو میر ہدایت علی نے بھی بسبب اتحادِ باطنی

---

[1] دیوان غریب ص ۱۱۱۔ [2] دیوان غریب ص ۱۱۱۔ [3] گلستان بے خزاں ص ۵۸

اپنا تخلص جلیلؔ کر لیا[۱]۔ اردو شعر و شاعری میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[۲]۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ اور نہ ان کا کلام ہی مل سکا۔ صرف دو غزلیں تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں مل جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

عکس افگن عارضِ جاناں نہ ہو اس میں اگر — ٹھوکریں کھاتا پھرے پھر رہ گزر میں آئینہ
قاتلِ عالم ہے اے سفاک خود بینی تری — تیغ کے بدلے تو رکھ اپنی کمر میں آئینہ
دوست دشمن کو ہدایت کیوں نہ سمجھے دل مرا — نیک و بد کو خوب رکھتا ہے نظر میں آئینہ

چاندنی ہر اک سو ہے گل کی باغ میں بو ہے — بادہ ہے لب جو ہے ساقی پری رو ہے
نازکی بدن میں ہے گل کی بو دہن میں ہے — معجزہ سخن میں ہے، چشمِ عینِ جادو ہے
بازو شمع روشن ہے، ماہ نو وہ جوشن ہے — صبح اُس کی گردن ہے، آفتاب جگنو ہے
بے ترے ہے ویرانہ، کعبہ اور بت خانہ — ہوں ترا میں پروانہ، شمع انجمن تو ہے
کیوں تر ارکا ہے دِل کیا پڑی تجھے مشکل — فکرِ شعر سے غافل، اے جلیلؔ جو تو ہے

جنوںؔ

نواب سراج الدولہ سردار جنگ خطاب اور محمد علی خاں نام۔ جنوںؔ تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام نواب محتشم الدولہ۔ مدبّر الملک مرزا باقر علی خاں فتح جنگ تھا[۳]۔ ان کے دادا نواب حسینؑ علی خاں بہادر بانس بریلی اور روہیلکھنڈ کے صوبے دار تھے[۴]۔ جنوںؔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے وزیر نواب روشن الدولہ کے داماد تھے[۵]۔ نواب

---

۱ و ۲۔ خوش معرکہ زیبا ص ۴۲۸۔ ۳۔ جواہر سخن جلد سوم ص ۶۳۹۔
۴۔ خم خانۂ جاوید ص ۲۷۰۔ ۵۔ جواہر سخن جلد سوم ص ۶۳۹۔

سراج الدولہ نے ادائلِ مشقِ سخن میں خواجہ آتش سے اصلاح لی۔ اُن کی وفات کے بعد حضرتِ اسیر کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ان کے دو دیوان سراج النظم اور مصباح النظم مطبع اثنا عشری لکھنؤ سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوئے تھے۔ اور دونوں دیوان صرف غزلوں کا مجموعہ ہیں۔ آغا حجو شرف نے اپنی کتاب افسانۂ لکھنؤ میں جنوںؔ کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:۔

سراج اور دولہ کا سنیے بیاں — امارت ہے خلقت میں خوش رو جواں
خدا نے دیا ہے بڑا اقتدار — لٹا غدر میں مال و زر بے شمار
عائد ارکین کامی یہ ہیں — کہ جاگیر داروں میں نامی یہ ہیں
غزل گوئی سے خوب ماہر ہیں یہ — ہمیشہ سے خوش فکر شاعر ہیں یہ
یہ شاگردِ آتش ہیں دونوں امیر — نہ کیوں کر ہوں خوش گوئی میں بے نظیر

جنوںؔ کا سالِ وفات اور سالِ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ اُن کے کلام میں اسیر کی آورد، آتش کی آمد پر غالب ہے۔ کلام میں لفظی شان و شکوہ پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اسی لیے کلام خشک ہے۔ رعایتِ لفظی سے زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ نازک خیالی اور زبان کی طرف توجہ کم نظر آتی ہے پھر بھی کلام میں صفائی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

بے خودی میں بھی خبر رکھتا ہے اُس کے حال کی — مجھ پہ یہ احسان ہے میرے دلِ آگاہ کا

یہی بہتر تھا جو بیمارِ غم اچھا نہ ہوا — شکر صد شکر کہ احسانِ مسیحا نہ ہوا

امتحاں کو گئے سو بار جنوںؔ گلشن میں — داغِ حسرت کے مقابل کبھی لالہ نہ ہوا

خضر نے بھی جب کہ بتلائی نہ راہِ کوئے دوست — شوق مرشد، شوق ہادی، شوق رہبر ہو گیا

اے پری ہر چند دیوانے ترے کثرت سے تھے — جامۂ وحشت جنوںؔ کے تن پہ زیبا ہو گیا

گل کو رُخ، سروسہی کو قدِ جاناں سمجھا	سنبلِ باغ کو میں گیسوئے پیچاں سمجھا

رُخ و کاکل کی محبت کا یہ انجام ہوا	کوئی کافر مجھے اور کوئی مسلماں سمجھا

صبح تک شام سے بستر پہ تڑپتے گزری	کون تکیہ کرے جھوٹے ترے اقراروں پر

اِک جلوہ دکھا دے انھیں اے شمعِ تجلی	پروانوں کو جل جانے کی لو دِل سے لگی ہے

دُعا وصالِ صنم کی نہ مستجاب ہوئی	زبان گِھس گئی اپنی خدا خدا کرتے

کوچے میں اس کے بیٹھ کے اٹھنا محال ہے	نقشِ قدم کی طرح سے میں ناتواں ہوا

طفلی میں مجھے دیکھ کے کہتا تھا منجّم	یہ طفل جواں ہوتے ہی دیوانہ بنے گا

تکلیف اٹھا پہلے جو راحت کا ہے خواہاں	بے چاک کی گردش کے نہ پیمانہ بنے گا

گر کہا اُس سے کہ مرتا ہوں تو یوں بولا وہ شوخ	تیرے اِک مرنے سے خالی شہر کیا ہو جائے گا

یادِ خالِ لبِ محبوب میں کی عمر بسر	ایک دانے پہ رہا ہم کو توکّل کیا کیا

پھر بہار آئی جنوں سلسلہ جنباں ہو گا	دشتِ وحشت سے مرا چاک گریباں ہو گا

دھوئی تھیں یار نے دریا میں جو زلفیں اک دن	سر کو ٹکراتی ہیں موجیں سرِ ساحل کیا کیا

بیٹھ کر مسجد میں زاہد صاحبِ تمکین ہوا۔ مے کدے جاتا تو مٹ جاتی یہ شخصیت تمام

وضو عاشق کا گر دیکھو تو دھونا ہاتھ ہے جان سے
عبادت اُس کی گر پوچھو تو سجدہ طاقِ ابرو کا

جہاں پر رکھتے ہیں اپنا قدم آپ زمیں کرتی ہے واں کی چرخ پر ناز

بعد اک زخم کے ہے زخمِ دگر کی حاجت اپنے قاتل سے نہیں ہوتی جنوں کی سیری

دیکھنا مجھ پر قیامت ہے گل و شمشاد کا قدّ و رُخ اس کا چمن میں یاد آتا ہے مجھے

بحث کرتے تھے بہم قمری و بلبل کیا کیا اس کے آتے ہی ہوئے باغ میں قصّے تیصل

کون اٹھائے گا ترے جور و جفا میرے بعد رنج مرنے کا نہیں ہے مگر اتنا غم ہے

وہ بو ہو کہ ہوا غنچوں میں پنہاں نظر آیا گلوں میں رنگ ہو کر
دو را ہے سے نکل دیر و حرم کے دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو کر

مجھ کو ہر شخص ترے گھر کا پتا دیتا ہے ڈھونڈنے جاتا ہوں جب میں دلِ برگشتہ کو

مصحفِ رخ کو کبھی ہاتھ لگانے نہ دیا میں مسلماں تھا وہ شاید مجھے کافر سمجھا

اپنے جینے کی خدا سے میں دعا کیا کرتا زندگی ہجر میں تھی موت سے بد تر اپنی

اِسی منہ پر مسیحائی کا دعویٰ آپ کرتے ہیں — کہ بیمارِ غمِ ہجراں کا درماں ہو نہیں سکتا

شراب عید کے دن شوق سے پئیں زاہد — حرام تیسرے فاقے حلال ہوتا ہے

نہ ہوگی حور کے زانو سے مومن کو کبھی یہ راحت
ملی راحت ہمارے سر کو جو خشتِ سرِ خُم سے

عشقِ لبِ جاں بخش میں ہونٹوں پہ رہا دم — اعجازِ مسیحا میرے کچھ کام نہ آیا

خط دے کے نامہ بر سے بھی پہلے روانہ ہے — کچھ شوقِ دل کا سب سے جدا کارخانہ ہے

شکوہ تیرا کروں معاذ اللہ — میری جانب سے یہ گماں نہ رہے

وطن کی سمت گئے چھُٹ کے قافلے والے — میں پا شکستہ تڑپتا ہوں کارواں کے لیے

گل چین و عندلیب میں کب تھیں عداوتیں — کانٹے یہ سارے بوئے ہوئے باغباں کے ہیں

حزیںؔ

نواب محمد علی خاں نام، حزیںؔ تخلّص تھا۔ والد کا نام آغا زین العابدین تھا جو لکھنؤ کے رئیس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے[1]۔ فنِ شعر و سخن میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد دوم ص ۳۹۸۔

لیتے تھے[1]۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں اور کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ صرف چند اشعار تذکرۂ خمِ خانہ جاوید اور دیوانِ غریب سے دستیاب ہوئے ہیں، وہی نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں!

کوئی اس بت کی خبر لاتا نہیں — اے خدا دم بھی نکل جاتا نہیں
کس قدر دلچسپ ہے ملکِ عدم — جو وہاں جاتا ہے پھر آتا نہیں
پھر لبوں پر آ رہی ہے جانِ زار — جذبۂ دل پھر انھیں لاتا نہیں
اف رے ضعف و صدمۂ دردِ جگر — طائرِ جاں سے اڑا جاتا نہیں

جی میں ہے چل کر کہیں ان سے حزیںؔ
اب غمِ دوری سہا جاتا نہیں

حزیںؔ

میر علی حسین نام، حزیںؔ تخلص تھا۔ فن شعر و سخن میں حضرتِ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[2]۔ سالِ ولادت اور سالِ وفات کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں۔ سنہ ۱۲۸۴ھ میں لکھنؤ میں زندہ سلامت موجود تھے[3]۔ آغا جوؔ شرفؔ نے اپنی کتاب انسانہ لکھنؤ میں حزیںؔ کا تعارف اس طرح کرایا ہے:۔

وہ خوش گو ہیں سید علی حسین — کہ شعر ان کے کھوتے ہیں عاشق کا چین
وہ دلچسپ ہوتا ہے ان کا کلام — کہ مشتاق رہتے ہیں سب خاص و عام
یہ مرد ولی ہیں، نمودار ہیں — مقدس یہ ہیں اور ابرار ہیں
نہ کس طرح شہرت ہو ہر شہر میں — یہ شاگرد آتشؔ کے ہیں دہر میں
جو ہے عشقِ آلِ عبا دل نشیں — تخلص اسی وجہ سے ہے حزیںؔ

---

[1] دیوانِ غریب جلد دوم ص ۳۹۸۔ [2] دیوانِ گلدستہ شعرا سنہ ۱۸۵۹ء۔ [3] خمِ خانہ جاوید جلد دوم ص ۳۹۸

بہت کوشش اور جستجو کے باوجود اس سے زیادہ اِن کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ دست یاب شدہ کلام بھی بہت مختصر ہے اور خاص لکھنوی رنگ میں ہے۔ بلند جذبات اور شاعرانہ تخیّل کا فقدان ہے۔ معمولی عاشقانہ مضامین کو لکھنوی رنگ میں نظم کیا ہے۔ کلام میں کوئی خاص دلکشی بھی نہیں ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

پھنکتا رہا جو یہ دلِ پرغم تمام شب
گریاں مثالِ شمع رہے ہم تمام شب

پہنے جو تم نے یار کرن پھول باغ میں
پتوں پہ لوٹتی رہی شبنم تمام شب

افشاں کے بار سے تو بتاتے ہو دردِ سر
صندل کا بوجھ اٹھے گا تمھاری جبیں سے کب

پیغامبر بھی ان کے کوچے میں رہا تو کیا
ادریسؑ جا کے آئے ہیں خلدِ بریں سے کب

یہ بھینی بھینی بو ہے ترے پیرہن کی یار
گلشن مہک رہا ہے گلِ یاسمیں سے کب

ابرِ تنک میں برق چمکتی ہے صاف صاف
وہ نور کی کلائی چھپے آستیں سے کب

خضر گھبرا کے ابھی نوح سے کشتی مانگیں
ابر برسے جو مرے دیدۂ تر کی صورت

دل جلوں کو بھی کھینچے گا جو دوزخ اے بت
چھپ رہیں گے کسی پتھر میں شرر کی صورت

کسی کروٹ نہیں اب چین خبر ہے فرقت میں
دل بھی پہلو میں پھڑکتا ہے جگر کی صورت

گردش میں جائے امن نہ ممکن ہوئی مجھے
سر پہ یہ آسماں رہا میں جہاں گیا

ملتا ہے روز اس پہ بھی کہتا ہے آدمی
کل کا بھی رزق دے مجھے پروردگار آج

دست وحشت سے جو الجھا دامنِ صحرا کوئی
دھجیاں اڑ جائیں گی میرے گریباں کی طرح

رُخِ مہ تاب نہ ہے مہر کی تنویر پسند
دل کے آئینے کو ہے یار کی تصویر پسند

اللہ رے لاغری کہ میں بیٹھا ہوں سامنے   مقتل میں ہو رہی ہے گنہ گار کی تلاش

حسینؔ

صاحبزادہ غلام حسین خاں نام، حسینؔ تخلص تھا۔ یہ صاحبزادہ احمد یار خاں افسرؔ کے فرزند تھے۔ افسرؔ کا تعلق شاہجہاں پور کے ایک رئیس گھرانے سے تھا، وہ اردو اور فارسی زبانوں کے شاعر بھی تھے۔ حسینؔ نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں، ان کا سالِ پیدائش اور سالِ وفات کا صراحت کے ساتھ علم نہ ہو سکا لیکن تذکرۂ انتخاب یادگار کے مصنف کا بیان ہے کہ انتخاب یادگار کی تصنیف کے وقت یہ بقیدِ حیات تھے اور ۷۶ برس کی عمر تھی[1] صاحب خم خانہ جاوید کی تحقیق کے مطابق اسی برس کی عمر میں ۱۲۸۱ھ میں انتقال فرمایا[2] اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۰۱ھ میں ہوئی۔

حسینؔ فن شعر و سخن میں آتشؔ کے شاگرد تھے اور صاحبِ دیوان بھی تھے۔ ان کا قلمی دیوان رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ یہ دیوان دو سو بیالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں غزلوں کے ساتھ مخمسؔ، مسدسؔ، اور واسوختؔ کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ یہ دیوان خوشخط لکھا ہوا ہے اور اس کا لائبریری کارڈ نمبر ۱۰۰۷ ہے۔

حسینؔ کے کلام میں خواجہ آتشؔ کی طرح مضمون کی بلندی اور شاعرانہ تخیلؔ کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کا کلام بناوٹ اور تکلفؔ سے پاک ہے متصوفانہ مضامین کو بھی بڑے دلکش انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ اثر آفرینی پر خاص توجہ دی گئی ہے نمونے کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہانہ ٹوٹنے میں کچھ نہیں درکار ہے اس کو   کہ میرا شیشۂ دل عہد ہے اک سست پیماں کا

---

[1] انتخاب یادگار ص ۱۱۵ ۔ [2] خم خانہ جاوید جلد دوم ص ۴۶۴۔

غیر کے ساتھ جو گلشن میں مرا ہو جانا
اے نسیمِ سحری تو بھی ہوا ہو جانا
کس کو بھاتا ہے یہ بے وجہ خفا ہو جانا
بات کی بات میں کیا سے ترا کیا ہو جانا
چاک کر جامۂ تشبیہ کو اِک بار حسینؔ
تجھ کو آتا ہے جو بندے سے خدا ہو جانا

ہاتھ خالی آئے تھے جائیں گے خالی ہاتھ ہم
واں سے ہم لائے تھے کیا اور یہاں سے لیجائیں گے کیا
ساتھ یاروں کا نہ چھوڑیں گے برنگِ خضر ہم
بوند پانی کے لیے رستے سے کترائیں گے کیا
حضرت واعظ عبث تشریف لائے ہیں حسینؔ
خود ہی جب سمجھے نہیں پھر مجھ کو سمجھائیں گے کیا

دشمنوں سے میں نے کب پوچھا نشانِ کوئے دوست
دوست کے جذبے کو پہچانا میانِ کوئے دوست

دشمن و دوست کی ہے عقل بجا میرے بعد
کیا ہوئی وہ نگہِ ہوش رُبا میرے بعد
اپنے مرنے کا مجھے بس ہے یہی رنج حسینؔ
کون رکھے گا تہِ تیغ گلا میرے بعد

ہجر کی تاثیر دِل پر کام اپنا کر چکی
اب امیدِ وصل جاناں عمر دیگر پر رہی
وا شد دِل تنگ نائے دہر میں ممکن نہیں
اپنی وحشت ملتوی صحرائے محشر پر رہی
کچھ نہ پوچھو ماجرا عہد جدائی کا حسینؔ
دِل ہی جانے ہے جو کچھ آفت مرے سر پر رہی

میٹھی چھری ہے حُسن حسینؔ اِس کا کیا علاج
ورنہ ہزار درد کی کڑوی دوا ہے عشق

از خود حسینؔ اس کی طرف کو نہ جائے گا
از خویش رفتگی تو ہی لے چل وہاں تلک

کیا کوئی زلف ہو گئی برہم
دِل کو اب تک تو پیچ و تاب نہ تھا۔

پھری تقدیر تو بھی یہ نہ دیکھا | کہ قاصد کوئے جاناں سے پھرا ہو

منہ کو کھولو نہ کرو شرم و حجاب آخرِ شب | کہ رخِ مہر سے اٹھتا ہے نقاب آخرِ شب

خانۂ کعبہ سے گر پڑ کے تو پہنچا ہے حسینؔ | کوچۂ یار میں اب اس کو خدایا پہنچا

میں تو تدبیر میں تھا زخمِ جگر کے مصروف | دل بھی پہلو میں تپاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

آگے ملنے کی کوئی راہ نکل آئیگی | بے قراری تو مجھے اس کے تو در تک پہنچا

تشنۂ آبِ دمِ خنجر ہے بسمل اور بھی | دستِ نازک کو ذرا تکلیف قاتل اور بھی

وہ ادب دانِ رہ و رسمِ وفا ہوں کہ حسینؔ | دست و پا اپنے تہِ تیغ ہلا بھی نہ سکوں

مستِ جامِ عشق رندِ بے سر و پا ہوں حسینؔ | میں نہ عابد ہوں نہ زاہد ہوں نہ ابراروں میں ہوں

دست و پا موسمِ گل میں تو ہلاؤں گا حسینؔ | ہتھکڑی لائے کوئی یا کوئی لائے زنجیر

کوچۂ یار کا احوال نہ کچھ پوچھ حسینؔ | جس طرف دیکھیے بسمل ہے یہاں بسمل پر

غیر نے جب ہاتھ رکھا اس کے کاندھے پر حسینؔ | میں کلیجا دونوں ہاتھوں سے دبا کر رہ گیا

حسینؔ اک دل کو دے کس کس کو آخر | ہزاروں بت ہیں یاں ہندوستاں ہے

تخمیس بر غزل خواجہ آتش ؔ

(مطلع غزل آتش ؔ)

حشر میں بھی دیکھنے کا اس کے ارماں رہ گیا　　دن چڑھے پر آفتاب آنکھوں سے پنہاں رہ گیا

دن نصیبِ مہر ہے اور مہ کا حصہ رات ہے　　ہیں صفت میں مختلف دونوں کی اک ہی ذات ہے
عشق کا مذکور کیا وہ موردِ آفات ہے　　حسن میں بھی عزت و دولت خدا کے ہاتھ ہے
گل کو پیراہن ملا تو شعلہ عریاں رہ گیا

اضطراری ہے ذبیحِ تیغِ قاتل کی تڑپ　　آ بنے جب جی پہ کیا کام آئے تب دل کی تڑپ
وقفۂ عمرِ شرر رکھتی ہے گھائل کی تڑپ　　حال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

باد کے جھونکے ہیں گویا سالکانِ ارجمند　　نے امیدِ عاقبت ان کو نہ کچھ بیم و گزند
دوش پر رہتی ہے اس فرتے کے ہمت کی کمند　　راہِ الفت میں کہاں اندیشۂ پست و بلند
گر کے کب یوسف میانِ چاہِ کنعاں رہ گیا

کچھ نہیں تقدیر میں تدبیر کو انساں کی دخل　　گم ہوئی اس جا حسینِ بے سر و ساماں کی عقل
سر پہ جا پہنچا ولیکن رہ گیا نس پر بھی فصل　　شام ہجراں صبح بھی کر کے نہ دیکھا روزِ وصل
سانپ کو کچلا پہ آتش ؔ گنج پنہاں رہ گیا

حنا ؔ

عبد الحکیم خاں نام حنا ؔ تخلص تھا۔ یہ خواجہ آتش ؔ سے اصلاح لیتے تھے[1] حضرت

---

[1] گلدستہ شعرا ۱۸۵۹ء۔

آتش کے انتقال کے بعد مظفر علی خاں اسیر کے حضور میں زانوئے تلمذ تہہ کیا[1] ان کا زمانہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کا زمانہ تھا۔ ایک پوری غزل لکھنؤ کی تعریف میں ملتی ہے۔ اِن کے حالات باوجود سعی کے حاصل نہ ہو سکے۔ یہ صاحب دیوان بھی تھے۔

اِن کا ایک قلمی دیوان رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے جس کا لائبریری کارڈ نمبر ۷۷، ۹ ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۲۵۶ھ کا لکھا ہوا ہے اور دو سو چوالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کلام کا جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ حنا کی شاعری خاص لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کلام میں خیال بندی اور مضمون آفرینی غالب ہے۔ انداز بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود بے اثر ہے۔ ان کا کلام فلسفۂ اخلاق اور تصوف کے مضامین سے عاری ہے ان سب باتوں کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حنا نے خواجہ آتش سے زیادہ مظفر علی خاں اسیر سے اثر قبول کیا ہے۔ نمونے کے لیے کلام ملاحظہ ہو:۔

یاں تلک وعدۂ فردا پسِ فردا ٹھہرا	حشر پر وصلِ بتِ حور لقا جا ٹھہرا
لوگ کہتے ہیں عیادت کو وہ کل آئیں گے	اور اک شب سفرِ مرگ میں وقفا ٹھہرا
آگیا مجھ کو تصور میں جو بوسے کا خیال	ہو کے برہم نہ خیالِ ستم آرا ٹھہرا
اٹھ گئی دہرِ جہاں سے حق و باطل کی تمیز	تم کہا جس نے زباں سے وہ سچا ٹھہرا
لے گئی کھینچ کے وحشت مجھے اس وادی میں	آدمی کیا نہ جہاں خوف سے سایا ٹھہرا

سوئے لپٹ کے اُس صنمِ نازنین سے کب	جاگے نصیب گردشِ چرخِ بریں سے کب
نکلے گا مر کے بھی نہ مرے دل سے عشقِ یار	ایسا مکان چھٹتا ہے اپنے مکیں سے کب

وہ بات بات پہ ہوئے برہم تمام شب	جاگے سرورِ وصل رہا غم تمام شب

---

[1] دیوانِ حنا قلمی ص ۲۴۴۔

یہ انتظار ہے بتِ وعدہ خلاف کا — رہتے ہیں در پہ روز کھڑے ہم تمام شب

دیکھ لیں دونوں کو انصاف سے پھر ہو مختار — اپنے تم تیرِ نظر میرے جگر کی صورت
تیغ سے اس بتِ قاتل نے کیا کارِ قلم — زخم تن پر ہیں مرے زیر و زبر کی صورت
الاماں کہنے لگے بھول کے طوفاں اپنا — دیکھ کر نوح مرے دیدۂ تر کی صورت

دی تو اُس زلفِ رسا سے شبِ فرقت کو مثال — پر یہ ڈر ہے کہ یہ شب اور نہ بڑھ جائے بہت
ضبطِ گریہ ہے مضر خانۂ تن کے حق میں — بیٹھ جاتا ہے مکاں پانی جو مر جائے بہت

شگفتہ ہوں خبرِ وصلِ یار کے باعث — چمن بنا ہوں نسیمِ بہار کے باعث
بلایا بام پہ اُس گل نے اے حنا ہم کو — دماغ چرخ پہ ہے افتخار کے باعث

رشکِ قصرِ خلد ہے ہر اک مکانِ لکھنؤ — جشنِ فردوس سے بہتر ہے نشانِ لکھنؤ
کوہ کن سے کم نہیں ہیں عاشقانِ لکھنؤ — رشکِ شیریں ہے ہر اک شیریں دہانِ لکھنؤ
کم نہیں حورِ جناں سے ہر طوائف حسن میں — غیرتِ غلماں ہے ہر اک نوجوانِ لکھنؤ
جس طرف دیکھو ہزاروں گلرخوں کا ہے ہجوم — ہے بری بادِ خزاں سے بوستانِ لکھنؤ
قصرِ جنت ہر مکاں ہے نخلِ [illegible] ہر شجر — طائرِ خلدِ بریں ہیں طائرانِ لکھنؤ
گومتی ہے حوضِ کوثر نہر نہرِ سلسبیل — رشکِ طوبیٰ ہے ہر اک سروِ روانِ لکھنؤ
جس نے دیکھا اُس نے دیکھی باغِ جنت کی بہار — باغِ رضواں سے نہیں کم بوستانِ لکھنؤ
کس زباں سے میں کروں یاں کی سخن گوئی کا وصف — بلبلِ شیریں زباں ہیں شاعرانِ لکھنؤ
جو یہاں کا طفل ہے وہ رشکِ جالینوس ہے — کم نہیں ہے شہرِ یوناں سے مکانِ لکھنؤ
کیوں نہ چھپ جائے بھلا چرخِ چہارم پر مسیح — معجزہ دکھلا رہے ہیں گلرخانِ لکھنؤ
بادشاہ اس شہر کا ہے دینِ احمد کا نصیر — کیوں نہ ہوں دیندار سارے مردمانِ لکھنؤ

سبز ہے یہ باغ سب فیضِ سلیمان جاہ سے
ہیں شجر باغِ جناں کے ساکنانِ لکھنؤ

واہ رے فیضِ تصور دشت میں بھی اے جنوں
دیکھتے ہیں ہم جمالِ دوستانِ لکھنؤ

مجھ کو اک لحظہ نہ ہو اس شہر سے فرصت نصیب
تا رہے زیرِ فلک یارب نشانِ لکھنؤ

عندلیبِ خوش بیاں ہوں اس چمن میں میں حنا
بعد میرے یہ خزاں ہے بوستانِ لکھنؤ

دل بتوں کے عشق میں دیوانہ ہے
گھر خدا کا آج کل بُت خانہ ہے

دوڑتا ہے شمع رویوں کی طرف
مر میں اپنے دل نہیں پروانہ ہے

خط پہ خط اُس کو رقم کرتا ہوں میں
میرے گھر کا نام دفتر خانہ ہے

جیسے مہماں ہے مرا وہ رشکِ حور
غیرتِ خلدِ بریں کاشانہ ہے

گرم بازاری کہوں کیا یار کی
قیمتِ یوسف یہاں بیعانہ ہے

آہ سوزاں کے سبب سے ہجر میں
غیرتِ گلخن مرا کاشانہ ہے

اے حنا اب تیسری ہے یہ غزل
اس میں سوزِ عشق کا افسانہ ہے

نکہتِ زلفِ صنم جب کہ صبا لاتی ہے
روح اپنے تنِ بے روح میں آجاتی ہے

کوئے جاناں میں رقیبوں کی صدا سنتا ہوں
ہائے جنت میں بھی آوازِ عدو آتی ہے

دل میں خیالِ روئے بتِ سرخ فام ہے
یہ طُرفہ شُعبدہ ہے کہ شیشے میں جام ہے

ہم کو تو یاد مصحفِ رخ کا کلام ہے
بینی الف ہے، میم دہن، زلف لام ہے

ساقی ہے، مے ہے، شیشہ ہے، مطرب ہے جام ہے
زاہد یہاں شراب نہ پینا حرام ہے

جور و جفا حنا یہ مناسب نہیں تمھیں
عاشق ہے، باوفا ہے، تمھارا غلام ہے

عاشقانہ ترے مضموں سراپا ہیں حنا
حق تعالیٰ نے عطا کی ہے تجھے مِیرؔ کی آنکھ

اے حنا دیر و حرم دونوں مکاں ہیں میرے
گبر کہتا ہے کوئی، کوئی مسلماں مجھ کو

کس کو سناؤ گے حنا اچھی غزل کہی تو کیا　　غم تو یہی ہے اور کیا شیخ علی حزیں نہیں

حنا کو مثلِ حنا اے گلو! نہ پیسو تم　　اب عاشقوں میں یہ اک دل فگار باقی ہے

دل نشیں ایسا خیالِ کعبۂ ابرو ہوا　　خواب میں بھی جانب کعبہ نہ اپنا رو ہوا

رباعی

کیوں کر نہ بہے آنکھوں سے خون کا نالا　　مارا ہے مجھے عشق نے غم کا بھالا
ہے دیدۂ پُرخوں میں خیالِ رخِ یار　　مہتاب کے ہے گرد شفق کا ہالا

حیدر

شاہ زادہ میرزا حیدر نام، حیدر تخلص تھا۔ فن شعر وسخن میں پہلے میر ضمیر سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد کو حضرت آتش کی طرف رجوع ہوئے۔ اور انھیں کے حضور میں زانوئے تلمذ تہ کیا[۱]۔ اس سے زیادہ ان کے حالات نہ معلوم ہو سکے۔ چند اشعار تذکرہ خوش معرکۂ زیبا سے نمونے کے طور پر درج کیے جا رہے ہیں۔

بلبل نہیں ہوں میں جو کروں بوستاں پسند　　عاشق ہوں تجھ کو یار کا ہے آستاں پسند
اے چرخ طعمۂ سگِ جاناں تو ہوئیں گے　　گر گور کو ہوئے نہ مرے استخواں پسند
دیکھے جو میرے سینۂ پُر داغ کا چمن　　ہوئے نہ عندلیب کو پھر بوستاں پسند
حیدر یہاں سے چلیے جہانگیر ہو جیے　　گر عزم ہے نہ کیجیے ہندوستاں پسند

---

[۱] خوش معرکۂ زیبا ص ۴۶۳۔

خلیلؔ

میر دوست علی نام اور خلیلؔ تخلص تھا۔ ان کے والد سید جمال علی قصبۂ بڈولی متعلقہ بارہا (اودھ) کے رہنے والے تھے۔ خلیلؔ واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں نظامت اور چکلہ داری کے عہدے پر فائز رہے[1]۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ ساری زندگی عیش و عشرت سے بسر کی۔ فن شعر و شاعری میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد ہوئے[2]۔ آغا حجو شرفؔ نے اپنی کتاب افسانۂ لکھنؤ میں خلیلؔ کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

جو ہو سیّد دوست یکجا رقم | علی کو بھی لکھیں پھر اہل قلم
یہ سیّد ہیں رتبہ ہے اِن کا جلیل | تخلص اِسی وجہ سے ہے خلیلؔ
سمندر کی ہے موجِ طبع رواں | بہت بڑھ کے ہیں حلم و علم بیاں
یہ شاگرد آتشؔ کے نامی ہوئے | کہ اس عہد میں مثلِ جامیؔ ہوئے[3]

خلیلؔ کی پیدائش اور وفات کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ ۱۲۷۹ھ میں جب کہ واجد علی شاہ کلکتے میں قید کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اس وقت خلیلؔ بھی کلکتے گئے تھے[4] مگر کچھ دنوں رہ کر لکھنؤ واپس آ گئے۔ عبد الغفور خاں نساخؔ کے دوستوں میں تھے[5]۔

خلیلؔ، آتشؔ کے باکمال شاگردوں میں تھے اور اپنے استاد کی بہت عزت کرتے تھے۔ بقول جلال الدین احمد جعفریؔ خواجہ آتشؔ کے انتقال پر دفن و کفن کا اہتمام بھی خلیلؔ ہی نے کیا تھا[6]۔

۱؎ جواہر سخن جلد سوم ص ۶۱۷۔ ۲؎ دیوان غریب ص ۱۵۳۔ ۳؎ افسانہ لکھنؤ ص ۱۴۱۔
۴؎ مجموعہ غزلیات دوم ص ۱۰۳۔ ۵؎ سخن شعراء، ص ۵۱۰۔
۶؎ مجموعہ غزلیات دوم ص ۱۰۳۔

اِن کا اردو دیوان مطبع نامی سے شائع ہوا تھا[1]۔ راقم نے بہت تلاش کیا مگر کہیں نہ مل سکا۔ خلیلؔ کا ایک قلمی دیوان رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس نسخے میں صرف غزلیں ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کا پتا نہیں چلتا۔ ایک دوسرا قلمی دیوان لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں بھی محفوظ ہے۔

کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیلؔ اپنے استاد کے رنگ کے خلاف شوکتِ الفاظ اور خیال بندی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ کلام میں اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار ہے۔ استعارہ اور تشبیہ کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ معشوق کے خدوخال زلف، کنگھی چوٹی اور دیگر لوازمات کے مضامین کثرت سے نظم کیے ہیں۔ اگرچہ دیوان میں عاشقانہ اور اخلاقی مضامین کے بھی اشعار ہیں مگر بہت کم۔ ڈھونڈنے سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو عشق و محبت کے مؤثر جذبات سے لبریز ہیں۔ غرض کہ جو رنگ اربابِ لکھنؤ اور شاگردانِ ناسخؔ و آتشؔ کا تھا اسی کی ہم رنگی خلیلؔ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے کلام میں کوئی خاص دلکشی نہیں ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

کیا بہار میں جس نے بتایا جو لٹکا	گیا نہ زلف کا سودا ہزار سر پٹکا
ہماری خاکِ لحد پر جو کچھ ہوا وسواس	ہزار مرتبہ دامن کو یار نے جھٹکا
جلائیں گی مرا دل سرد مہریاں تیری	کہ برف کھانے سے ہوتا ہے پیاس کا کھٹکا
ہوا خراب میں اُس شہسوار کے پیچھے	لگی نہ گردِ قدم ہاتھ لاکھ سر پٹکا
جمالِ یار کو دیکھوں نہ بے حجاب کبھی	مقامِ رشک ہے آنکھوں سے دل کو ہے کھٹکا
رہی خلیلؔ یہ نفرت ہمیں تصنع سے	کیا نہ نظم کبھی قافیہ بناوٹ کا

منہ نہ محشر میں بھی دکھلایئے گا	بھیڑ میں اور بھی شرمایئے گا
میں گنہ گار ہوں میرے گھر میں	رحمتِ حق کی طرح آیئے گا
یار نے آکے دمِ نزع کہا	کیا ارادہ ہے کہاں جایئے گا

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد پنجم ص ۱۴۱۔

چال پر مرے نہ اُس بت کی خلیقؔ　　دوڑ کچھ ہوگی نہ پچھتائیے گا

وہ جو گئے باغ میں مثلِ نسیم　　رشک سے رنگِ گل تراڑ گیا
ہو گیا مشہور مرا رازِ عشق　　خلق میں مانندِ خبر اڑ گیا
خلق میں ٹھہرا نہ کوئی گرم رو　　سنگ سے نکلا تو شرر اڑ گیا
کیا کہوں وحشت میں کدھر کا ہے غم　　گردِ بیاباں ہوں جدھر اڑ گیا

بسر کی عصیاں میں عمر ساری بتوں سے در پردہ دل لگاکر
الٰہی توبہ الٰہی توبہ گنہ کیے ہیں چھپا چھپا کر
نہ کر تصوّر بتوں کا دل میں محل توبہ ہے کچھ حیا کر
خلیقؔ کعبے میں بت پرستی خدا خدا کر خدا خدا کر
کیا نہ رازِ محبت افشا ہزار صدمے اٹھائے میں نے
ضمیرِ پنہاں کی طرح رکھا ہے دل میں اس کو چھپا چھپا کر
بتوں کو بھی بد نہ کہیے واعظ خدا کو گر ایک جانتا ہے
نکال حرفِ دوئی نہ منہ سے خدا خدا کر خدا خدا کر
بتانِ ہندوستان میں تونے بہت سی کی سیرِ بت پرستی
خلیقؔ کعبے میں چل کے یاں سے بس اب کوئی دن خدا خدا کر

کرتے ہیں پیرہن کو مرے تار تار ہاتھ　　ہو جاتے ہیں بہار میں بے اختیار ہاتھ
اُس بُت کو دیکھتے ہی ہوا دل اسیرِ عشق　　پتھر کے نیچے دب گئے بے اختیار ہاتھ

زلف سے دل کو اڑا لینا ہے خط　　چور کے گھر میں یہ گویا مور ہے
یار گھر جائے گا مر جائیں گے ہم　　صبح کی نوبت پہ اپنی بھور ہے

قافیے موزوں کیے سب اے خلیلؔ اور جو باقی ہے وہ آخور ہے

جان پر کھیلا تو وصل اُس سے ہوا عشق کی بازی کو جیتا ہار کے
چلتے چلتے عاشقوں کے حلق پر آگیا دمِ لب پہ تیغِ یار کے
اب قفس میں ہیں کبھی اے ہم صفیر ہم بھی بلبل تھے کسی گلزار کے
رنگ روئے گُل سے یہ ثابت ہوا منہ پہ رونق ہوتی ہے زر دار کے
کس کو قید کفر و ایماں ہے خلیلؔ ہم ہیں بندے عشقِ زلفِ یار کے

ہوتی ہے شکست اس کو جو مجھ رند سے اکثر جب دیکھیے توبہ درِ قاضی پہ کھڑی ہے
کیا درد سے واقف ہو وہ بے درد کہ جس کے کانٹا ہی چبھا ہے نہ کوئی پھانس گڑی ہے
دنیا میں جسے دیکھیے بندہ ہے شکم کا جنت کا تصور نہیں دوزخ کی پڑی ہے
اے سیم بدن عیب درشتی نہیں اچھا بازار میں کم نرخ ہے چاندی جو کڑی ہے
کر رحم کہ تا مزرعِ اعمال ہو سرسبز کھیتی مری اے ابرِ کرم خشک پڑی ہے
کیا پردہ نشیں ہے کوئی روتے ہو جو چھپ کر بتلاؤ تو یہ کس سے خلیلؔ آنکھ لڑی ہے

ناقصوں پر نظرِ مہر نہ رکھتا جو فلک لعل پتھر کو نہ پھر سیپ کو گوہر ملتا

جب عرضِ حال کرتا ہوں کہتا ہے وہ صنم کچھ اور کہیے یہ تو ہے قصّہ سنا ہوا

وہ رنگ ہے ترا کہ ترے رنگ کے آگے جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا

آدمی وہ ہے کہ جو حضرتِ آدم کی طرح شیرِ مادر کا بھی شرمندۂ احساں نہ ہوا

کبھی دیکھا جو ابلتے ہوئے مے کو خُم سے
جوشؔ اپنی بھی جوانی کا مجھے یاد آیا

اہل دنیا ہیں تمام اپنی غرض کے بندے
پڑ گئی جب کوئی مشکل تو خدا یاد آیا

کٹتی نہیں ہیں مجرمِ الفت کی بیڑیاں
جو مر گیا وہ قید سے آزاد ہو گیا

ہاتھ پورا نہ پڑا زخم لگائے اوچھے
قتل کرنا بھی نہ تجھ کو مرے جلادؔ آیا

جس نے پوچھا یہی جواب ملا
آدمی باوفا نہیں ملتا

عاشق ہوں بتو! تم مجھے جو چاہو سزا دو
اللہ کا بندہ ہوں گنہ گار تمہارا

قاتل نے بعدِ قتل مرے مسکرا دیا
کیا خوب خون بہا کے مجھے خون بہا دیا

کھنچتے ہو دور ہم سے ہمارا قصور ہے
کیوں چاند کہہ کے تم کو فلک پر چڑھا دیا

شبِ غم میں دِل پر قلق جب ہوا
خیال اس کا آ کر خبر لے گیا

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا مجھ کو
اٹھیے، گھر جائیے، دم لے چکے، سستائے بہت

بتوں کا سبزۂ خط خال کا نہیں محتاج
بغیر مہر یہ خط اعتبار رکھتا ہے

رونے پہ باندھے جو مری چشمِ تر کمر
کیسی زمیں فلک پہ ہو پانی کمر کمر

تم سنو یا نہ سنو نالے کیے جاؤں گا
دردِ دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو

خوشوقتؔ

منشی خوشوقت رائے نام اور خوشوقتؔ تخلص تھا۔ راجہ بینی جی کے نام سے مشہور تھے۔ بخشی الملک راجہ لال جی بہادر بخشی زمانہ شاہی لکھنؤ کے بیٹے تھے۔[1] گاہ گاہ مستؔ تخلص بھی کر لیتے تھے۔ فن شعر و شاعری میں حضرت آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ آتشؔ کی وفات کے بعد میر وزیر علی صبا کو کلام دکھانے لگے۔ پیدائش اور وفات کے بارے میں تفصیل سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بقولِ مصنفِ خم خانۂ جاوید غدر کے دس بارہ سال بعد انتقال کیا۔[2] ان کا دیوان بھی راقم کی نظر سے نہیں گزرا چند اشعار خم خانۂ جاوید میں ملتے ہیں جو نمونے کے لیے درج ذیل ہیں:

گیسوؤں کا جو لیے دام وہ گلفام آیا ۔۔۔ بلبلِ دل مرا خود اڑ کے تہِ دام آیا

شکلِ مہ و خورشید تو کب دل میں گڑے گی ۔۔۔ جب آنکھ پڑے گی کسی اونچے پہ پڑے گی

اس دل کے لگانے کا ہم انجام نہ سمجھے ۔۔۔ پتھر میں یہ برچھی نہ کسی طرح گڑے گی

نوکِ مژۂ یار کا کرنا نہ تصوّر ۔۔۔ نکلے گی نہ پھر دل میں جو یہ پھانس گڑے گی

ہے صلح کی تدبیر عبث یار سے خوشوقتؔ ۔۔۔ مل جائے گا خود آپ سے قسمت جو لڑے گی

عجب کمال پہ جوبن ترا شباب میں ہے ۔۔۔ یہ ضو یہ نور نہ مہ میں نہ آفتاب میں ہے

ادا جان لیتی ہے جانی تمھاری ۔۔۔ قیامت ہوئی ہے جوانی تمھاری

تمھارا ہے وردِ زباں ذکر ہر دم ۔۔۔ وظیفہ مرا ہے کہانی تمھاری

یہ خوشوقتؔ آتشؔ کے فیض و کرم سے ۔۔۔ زباں زد ہوئی خوش بیانی تمھاری

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۸۹ ـ [2] ایضاً۔

رضاؔ

مولوی محمد قطب الدین حسن نام اور رضاؔ تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر بعد میں سکونت ترک کر کے حیدر آباد چلے گئے اور وہیں ہائیکورٹ میں وکالت کرتے رہے[1]۔ فن شعر و سخن میں حضرتِ آتشؔ کے شاگرد تھے[2] رضا کے شاگردوں میں عبدالقادر قادرؔ نے خوب شہرت حاصل کی۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ ایک غزل معیارِ سخن نامی گلدستے میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔[3]

بلبلوں پر خاتمہ ہی ہو گیا فریاد کا
شور و افغاں سے اٹھایا سر پہ گھر صیاد کا

واعظوں کی کون سنتا ہے بہارِ باغ میں
حضرتِ دل میں ہوں پابند آپ کے ارشاد کا

شکل آتی ہے شہادت کی نظر کس حسن سے
خنجرِ قاتل مجھے آئینہ ہے فولاد کا

شاعروں کو آپ کا یہ قدِّ موزوں دیکھ کر
مصرعِ شمشاد پر موقع ملا ایراد کا

لے گیا جذبِ محبت عاشقوں کو کھینچ کر
ورنہ پریوں میں بھلا کیا کام آدم زاد کا

مژدۂ فصلِ بہاری گوش زد ہے چار سو
آ گیا زوروں پہ پھر موسم مبارک باد کا

لکھ گیا قسمت میں عشقِ سروِ دل جوئے صنم
خطِ پیشانی ہمارا ہے الف زاد کا

بیتِ ہستی کے کبھی معنی خوب روشن ہو گئے
واہ کیا کہنا ہے آتشؔ سے رضاؔ استاد کا

رندؔ

سید محمد خاں نام اور رندؔ تخلص تھا۔ یہ نواب نجف خاں کے نواسے اور

---

[1] معیارِ سخن، ربیع الثانی ۱۳۱۱ھ ص ۴۰۔ [2] تذکرۂ یادگارِ ضیغم ص ۲۹۵

[3] معیارِ سخن، گلدستہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۱ھ ص ۴۰: تبعہ آغا حسین میرزا ہجر لکھنوی

نواب سراج الدولہ غیاث محمد خاں بہادر نصرت جنگ نیشاپوری کے بیٹے تھے۔ جو نواب سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے۔ رندؔ نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت میں ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو بروز جمعہ فیض آباد میں پیدا ہوئے انھوں نے اپنی ولادت کی تاریخ خود ہی نظم کی ہے جو دیوانِ ثانی میں درج ہے ؎

میں روز و ماہ و سال اپنے تولّد کا بتاتا ہوں
وہ رکھیں یاد تحقیقات جن لوگوں کی عادت ہے

سن و ہجری یہ تھے بارہ سو بارہ جمعہ کا دن تھا
ربیع الاول کی گیارہویں روز ولادت ہے

عہد طفلی سے لے کر اٹھائیس برس کی عمر تک جناب امتہ الزہرا بیگم عرف نواب بہو بیگم زوجہ نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرپرستی اور نگرانی میں انتہائی ناز و نعم کے ساتھ زندگی پرورش ہوتی رہی، اور اس طرح محلاتِ شاہی کی چہار دیواری میں رہ کر، دلکشی اور عیش و نشاط کے دلچسپ ماحول میں، ان کے ذہن کی نشو و نما ہوتی رہی، یہ اسی ماحول کا فیض تھا کہ بچپن ہی سے طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی اور ہوش سنبھالتے ہی یہ عشق و محبت کے رموز سے بخوبی واقف ہو گئے، اور عاشقانہ اشعار یاد کرنے، اور ان سے لطف اندوز ہونے میں دلچسپی لینے لگے۔ گویا تحصیلِ علم کے سلسلے میں انھیں کسی مدرسے یا تعلیمی ادارے میں جاکر درس لینے کا موقع نہیں ملا سب کچھ انھوں نے اپنے اسی دلچسپ ماحول اور سوسائٹی سے سیکھا، جس میں وہ پلے اور بڑھے۔ وہ اپنے دیوانِ اول موسوم بہ گلدستۂ عشق کے خاتمے میں خود ہی لکھتے ہیں:۔

روز و شب بہ مطالعہ دواوین اساتذہ متقدمین چہ فارسی وچہ ہندی صرف اوقات می نمود و اصلا بہ تحصیل کتب درسی نمی پرداخت و ابیات عاشقانہ بیش از حد و زیادہ از عدد از بر نمودہ مانند عندلیب فصلِ بہاری زمزمہ شعر خوانی بلندی ساخت و باستماع ابیات عاشقانہ حالتِ وجد

طاری می شود و دل عشق منزل مثلِ مرغِ بسمل بے تابانہ می طپید۔"[1]

رندؔ فیض آباد کے قیام کے دوران وفاؔ تخلص کرتے تھے اور شعر گوئی میں میر مستحسن خلیقؔ (جو میر انیسؔ کے والد اور استاد تھے) سے اصلاح لیتے تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے ایک مکمل دیوان بھی مرتب کر لیا تھا جس میں مراثی، سلام، رباعیاں، اور غزلیں وغیرہ تھیں مگر بقول مصنف گل رعنا کلام کا وہ مجموعہ جو خلیق کے فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا، رند نے فیض آباد چھوڑنے سے قبل ہی ضائع کر دیا تھا۔

جب نواب بہو بیگم کا انتقال ہو گیا اور میر خلیق بھی ترکِ سکونت کر کے فیض آباد سے فرخ آباد چلے گئے، تو رندؔ نے بھی اودھ کے دار الخلافہ لکھنؤ کی راہ لی اور یہاں آ کر انھوں نے حضرتِ آتشؔ کی شاگردی اختیار کی، اور انھیں کی خواہش کے مطابق وفاؔ تخلص چھوڑ کر رند تخلص اختیار کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں:-

میر مستحسن خلیقؔ کہ در فن مرثیہ گوئی عدیل و نظیر ندارند، شغل مشاورت می داشت۔ بعد چندے میر موصوف روانہ فرخ آباد شدند و راقم اثیم بتاریخ ہفتم رجب ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء از فیض آباد وارد دار الخلافۃ لکھنؤ گردید از حسن اتفاقات...... ابلغ البلغا و افصح الفصحا جناب خواجہ حیدر علی صاحب متخلص بہ آتشؔ مدظلہ العالی ملاقات اتفاق افتاد بصد شوق و کمال ذوق استدعای تلمذ بخدمت شان نمودم۔ از وفور مہربانی ہا واقتضائے حسن واخلاق .... عرض آنم مقبول گردید...... و تخلص خود کہ اسم با مسمیٰ یافتم حسب ارشاد جناب مخدومی رندؔ قرار دادم و اجزائے سابقہ کہ مثلِ یوسف عزیزی می داشتم روبروئے اخوان زماں بالتمام در چاہ انداختم و آں چہ از ابتدائے شاگردی جناب مخدومی لغایت آخر ماہ رجب ۱۲۵۸ھ رطب و یابس موزوں کردم، داخلِ کلیات ہذا نمودہ۔"[2]

[1] گلدستۂ عشق - دیوان اول رند ص ۱۶۷۔ [2] گلدستۂ عشق ص ۱۶۸۔

اس طرح جب رندؔ نے ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء میں فیض آباد سے سکونت ترک کر کے لکھنؤ وارد ہوئے تو اس وقت غازی الدین حیدرؔ اودھ کی خود مختاری کا اعلان کر کے بحیثیت بادشاہ کے تخت نشین ہو چکے تھے۔ حسنِ اتفاق سے خواجہ آتشؔ جیسا استاد ان کے حصے میں آیا پھر کیا تھا۔ رنگِ سخن نکھرتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اپنے ہمعصر شعرا میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ اور آتشؔ کی شاگردی رندؔ کے لیے باعثِ عزّ و شرف ہو گئی۔ اس بات کا اظہار انھوں نے خود کئی جگہ کیا ہے ؎

دس برس دیکھی ہو آتشؔ سے جب استاد کی آنکھ
کس طرح سے نہ فنِ شعر میں کامل ہو رندؔ

ہو گئے ہیں دس برس آگے مرید اس پیر کے
رندؔ لیں اصلاح کس سے خواجہ آتشؔ کے سوا

جو غزل حضرتِ آتشؔ کو دکھا لیتے ہیں
عیب سے پاک و مبرّا ہے کلام ان کا رندؔ

خصوصاً اُس غزل کے مقطع میں جو مشاعرے میں سرخرو ہونے پر کہی تھی اور جس کا مطلع یہ تھا ؎

وحشتِ دل ترے اقبال سے میداں جیتا
کوہِ فرہاد سے مجنوں نے بیاباں جیتا

بڑے جوشِ عقیدت اور خلوص و نیازمندی سے کہتے ہیں ؎

معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا
چل کے اب عرض کرو حضرتِ آتشؔ سے رندؔ

اور پھر استاد کے فیضِ صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی قادر الکلامی کا اظہار بھی فخریہ انداز میں کرنے لگے۔

عاشق ہیں رندؔ ہم تو اسی بول چال کے
تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میرؔ سے

شاعرانِ ہند میں کہتے ہیں طرزِ میرؔ ہم
شیخ ناسخؔ خواجہ آتشؔ کے سوا بالفعل رندؔ

اسی سلسلے میں ایک واقعہ رندؔ کے بارے میں مشہور ہے کہ جس زمانے میں رندؔ کا کمال سخن شہرت عام پا چکا تھا اور چاروں طرف سے واہ واہ کے نعرے گونج رہے تھے رندؔ نے ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے ؎

پھر لہو سرخ ہوا جسم میں کالا ہوکر　　رہ گیا اب کے برس بھی مجھے سودا ہوکر

اور اسی غزل میں ایک شعر یہ بھی کہا۔

اگرئی کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا　　رنگ لایا ہے دوپٹہ تیرا میلا ہوکر

رندؔ جوشِ مسرّت میں یہ غزل لے کر استاد کے پاس گئے، اور کہا کہ "اس زمین میں "میلا" کا دشوار قافیہ جیسا کہ اس نیازمند نے باندھا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں۔" آتشؔ بھی زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ اپنے استاد مصحفیؔ سے کفن بگڑا، دہن بگڑا کے معرکے میں ایسی حجّت کر چکے تھے، سمجھ گئے کہ حوصلہ مند شاگرد کے دِل میں اب کچھ ولولۂ استادی پیدا ہو چلا ہے۔ اس لیے اُس وقت تو چپ رہے، بعد کو ایک دوسرے شاگرد کی غزل میں وہی قافیہ خود باندھا۔ اور مشاعرے میں پڑھوایا۔ فرماتے ہیں ؎

بلبلِ کشتہ کو صیّاد کفن کیا دیتا　　پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہوکر

شاگرد کے دل پر چوٹ تو ضرور لگی مگر سعادت مندی سے اس چوٹ کو پی گئے اور زبان پر اُف تک نہ لائے۔

رندؔ باوجود آتشؔ کے شاگرد ہونے کے ناسخؔ کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک بار ایک غزل نئی بحر میں تصنیف کی اور ناسخؔ کے پاس بغرض اصلاح بھیجی۔ شیخ صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:۔

"از قرائن معلوم می شود کہ...... ارکین کامل دوافر را بکار بردہ اضمار وعصب را آوردہ اند وگرنہ از دوائر خارج است مستفعلن از متفاعلن باضمار ومفاعیلن از مفاعلتن بعصب گرفتہ مستفعلن ومفاعیلن کردہ اند سبحان اللہ۔"

غزل کا مطلع یہ ہے ؎

تدبیر کچھ نہیں بنتی کیا موت سے ندامت ہے　　مدّت ہوئی نہیں دیکھا دلدار کو قیامت ہے

رند کے بارے میں صاحب خم خانۂ جاوید لکھتے ہیں کہ رند ایک نوجوان حسین، عاشق مزاج اور دولت مند رئیس زادے تھے۔ رام بابو سکسینہ کا بیان ہے "تخلص کی مناسبت سے رندانہ زندگی بسر کرتے تھے"، اور دربار اودھ کی مشہور عیش و عشرت اور مزہ داریوں کا بھرپور لطف اٹھاتے تھے۔ مگر دیگر تذکرہ نگار سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ رند آخر عمر میں تائب ہو گئے تھے اور رام بابو سکسینہ کے ہی بیان کے مطابق آتش کی وفات کے وقت شراب نوشی بالکل ترک کر چکے تھے، اور رفتہ رفتہ شعر گوئی بھی ترک کر دی۔

رند کی صحیح تاریخِ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ مختلف تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ رند بسلسلۂ حج و زیارتِ عتباتِ عالیات ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ ابھی بمبئی تک ہی پہنچے تھے کہ ملک میں ہر طرف انتشار پھیل گیا اور آگے نہ جا سکے۔ وہیں کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوئے اور انتقال ہو گیا۔[1]

رند نے ایک کلیات اپنی یادگار چھوڑا ہے مروّجہ کلیات میں دو دیوان ہیں ایک تو دیوان گلدستۂ عشق ہے جس کو خود مصنّف نے غالباً ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں مرتب کیا تھا، اور دوسرا دیوان غیر مکمل ہے جو رند کی وفات کے بعد ترتیب دیا گیا۔ راقم کے پیشِ نظر جو کلیّات ہے۔ وہ نولکشور پریس سے ۱۲۸۴ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس نسخے میں دونوں دیوان شامل ہیں۔ یہ کلیات ۲۱۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں تقریباً سات ہزار اشعار غزلیات کے ہوں گے۔

رند کی غزلیات کو دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا مرکّب کہا جا سکتا ہے۔ وہ کبھی تو طرز میر میں کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو کبھی جرأت اور مصحفی کے رنگ میں طبع آزما ہوتے ہیں کبھی خاص لکھنوی زبان اور محاورے بولتے نظر آتے ہیں، تو کبھی اساتذۂ متقدمین کی پیروی میں متروکات کو بھی استعمال کرنے لگتے ہیں اور کبھی تو ابتذال اور عریانی میں جان

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۵۸۵۔

صاحب اور میاں عصمتؔ جیسے نخش گو سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی رندؔ کی غزلوں میں درد و غم، تصوّف و اخلاق، بے ثباتیِ دنیا، عشق و محبت کے لطیف جذبات معشوق کے ناز و انداز، ہجر و فراق، اور ظرافت و طراری، غرض ہر طرح کے حکیمانہ اور فلسفیانہ مضامین بہت سنجیدگی، اور خوش اسلوبی سے پیش کیے گئے ہیں ان کی غزلیات عاشقانہ مضامین کا بہترین نمونہ ہیں۔ مؤلف کاشف الحقائق رندؔ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ان کی (رندؔ کی) غزل سرائی قابل لحاظ ہے۔ شستگی زبان، خوبیٔ بندش صفائی کلام، روانیِ طبع کی صفتیں اس درجہ تمام دیوان میں آشکارا ہیں کہ جس غزل کو جہاں سے پڑھیے یہ صفتیں اپنے جلوے دکھا رہی ہیں........ ہر شعر کہتا ہے کہ میں رندؔ کے نتائجِ افکار سے ہوں....... واضح ہو کہ رندؔ برخلاف اپنے ملکی رنگ کے بیشتر شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں اس لیے ان کی غزلیں غزلیات کا مزہ دیتی ہیں۔ اگر ان کے کلام میں خستگی، برجستگی، سوز و گداز، درد و متانت وغیرہ کے مواد حسبِ مراد ہوتے تو ان کو دردؔ، میرؔ غالبؔ کے ساتھ ہمسری حاصل ہوتی۔"[1]

صاحب خم خانۂ جاوید لکھتے ہیں کہ:۔

محاورات، روزمرہ، شوخی و طراری، فصاحت و سادگی، تاثیر و معنی آفرینی کے جوہر قسامِ ازل نے رندؔ میں خاص طور پر ودیعت رکھا تھا معاملاتِ راز و نیاز میں کوئی جگ بیتی کہتا تھا مگر رندؔ آپ بیتی کہتا تھا ان کا مجموعہ غزلیات ان تمام رندانہ عاشقانہ مضامین کا گنجینہ ہے جو ایک مہذب زبان کے دلکش الفاظ میں ہونا چاہیے۔"[2]

رندؔ نے اپنی غزلیات میں شانِ استادی کے جو کرشمے دکھائے ہیں، اس کا اندازہ خود قارئین ان کے انتخابِ کلام سے لگا سکتے ہیں۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

ناز بیجا اٹھائیں گے کس کے   اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

---

[1] کاشف الحقائق جلد دوم ص ۱۵۸۔ [2] خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۵۱۸

بھولے بیٹھے ہیں عبث حسنِ دو روزہ پہ وہ رند یاد آئے گی بہت میری وفا میرے بعد

قید ملت میں پھنسے چھوڑ کے رندانہ طریق کیسے جھگڑے میں تم اے کافرِ دیندار پڑے

گذرے جس دم ہم دنیا سے ہم نے جانا دنیا گذری

ہیں اب تو چلن یار کے دنیا سے نرالے لو دیکھتے ہی دیکھتے کیا پاؤں نکالے

زہد و تقویٰ سے پھر اے رند میں گھبرا اٹھا پھر چلا دیر کو مسجد سے مصلّا اٹھا
تاب نظارۂ دیدار نہ لاؤ گے کلیم پردے پڑ جائیں گے آنکھوں پہ جو پردہ اٹھا

تو گرفتاری میں چندے یادِ گلشن کی رہی اب قفس سے چھوٹ کے گھر یاد آئے گا صیّاد کا

پائی جو خبر آمدِ فصلِ بہار کی کیا پھڑپھڑا کے مرغِ گرفتار رہ گیا

بتانِ سنگ دل سے بے سبب کیوں دل لگا بیٹھے
یہ شیشہ دیدہ و دانستہ کیوں پتھر پہ دے پٹکا

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

قدر میری تجھے نہ تھی صیّاد ہاتھ ملتا ہے کیوں رہا کر کے

حقِ صحبت تجھ پہ واجب ہے قفس تک اے صبا چند برگِ گل اڑا لے جا برائے عندلیب

پھر وہی کنجِ قفس ہے وہی صیاد کا گھر　　چار دن اور رہوا باغ کی کھالے بلبل
کسی غنچے کو چھوا اور نہ کوئی گل توڑا　　گھورتی کیوں ہے مجھے آنکھیں نکالے بلبل

رند کے دیوان میں خاص لکھنوی رنگ کے اشعار بھی بھرے پڑے ہیں۔ ان میں ابتذال و عریانی، رکاکت و رعایت لفظی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نمونے کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کیا آسمان بچھاڑ کے تھگلی لگائے گی　　صاحب ابھی چلی ہے بہت گات آپ کی

پھر نہ رہ جائے دلا! کوئی تمنّا باقی　　صبح تک یار سے ہو بوس و کنار آج کی رات

اٹھ گیا اُس کا دوپٹہ جو ہوا سے اے رندؔ　　صاف آئینے سے وہ پیٹ مصفّا دیکھا

رشکِ بلقیس بنایا ہے خدا نے تجھ کو　　بدلوں خاتم سے سلیماں کی نہ چھلاّ تیرا

کشتہ کیا ہے اِک بتِ وحشی مزاج نے　　ہو شامیانہ گور پہ آہو کی کھال کا

ساری رگیں ہوئی ہیں تنِ زار پر نمود　　بے طاقتی نے جسم کو مِسطر بنا دیا

مختصر یہ کہ اگرچہ رندؔ کے دوّاوین میں رکاکت و ابتذال کے اشعار بھرے پڑے ہیں مگر کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مذکورہ برائیوں سے پاک اور بلند معیار سے قریب تر ہے۔ بہت سی غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں مثل اپنے استاد کے عشق کی گرمی اور محبت کا سوز بدرجہ اتم موجود ہے مثلاً ذیل کے اشعار :۔

بھلا کب تلک چشمِ تر جائے گی　　یہ ندّی چڑھی ہے اتر جائے گی
بس اب آپ تشریف لے جایئے　　جو گزرے گی مجھ پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز　　ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

رہے گا نہ یوں حسن ناپائدار   کوئی دن میں صورت بدل جائے گی
طبیعت کا میری کرو تم نہ دھیان   سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائے گی

رندؔ کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ رباعی، قصیدہ، مثنوی، مخمس، مسدس، واسوخت اور اشعارِ متفرق بھی ہیں۔ غرض کہ رندؔ نے سبھی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔

رندؔ کی دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے۔

رباعی

تنہا جو کبھی یار کو پاتا ہوں میں   بے تاب ہو دوڑ کر لپٹ جاتا ہوں
کہتا ہے وہ مسکرا کے اے رندؔ سنا   میں تیری انھیں باتوں سے گھبراتا ہوں

رباعی

ہو کے بیزار عبث گھر کو نہ جاؤ آؤ   تھوڑے سے رنج کو اتنا نہ بڑھاؤ آؤ
دل نہیں دیتا عبث گھر کو نہ جاؤ آؤ   روٹھے جاتے ہو اسی بات پہ آؤ آؤ

رندؔ نے قصیدے جیسی مشکل صنفِ سخن میں بھی کہنہ مشقی اور استادی کا ثبوت دیا ہے نواب علی نقی خاں وزیر شاہِ اودھ کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے اس کی تشبیب میں فرماتے ہیں ؎

فیض سے بادِ بہاری کے کرے گا امسال   آہِ بلبل کے شجر سے گل تاثیر ظہور
قوتِ نامیہ کے نشو و نما کے باعث   دانۂ اشک بھی سرسبز اگر ہو گیا دور
آنکھ اٹھا دیکھو شگوفے کی طرف جو گل ہے   یدِ بیضا سا چمکتا ہے ہر اک شاخ پہ نور
گرد پھرتی ہے خیاباں کے نسیمِ سحری   گل سے دامن کو صبا اپنے کیے ہے معمور

ایک مثنوی جو رندؔ کے دیوان میں درج ہے، دراصل یہ ایک نامۂ شوقیہ ہے جو اپنے محبوب کے پاس فرخ آباد سے روانہ کیا گیا تھا۔ فنی نقطۂ نظر سے یہ مثنوی بہت معمولی درجے کی ہے بلکہ یہ نظم بالکل قابلِ تحسین نہیں ہے۔

رندؔ نے بہت سے خمسے اپنی ہی کہی ہوئی غزلوں پر کہے ہیں اور ایک خمسہ نواب

میرزا شوقؔ کی غزل پر ہے جس کا مطلع ہے ۔

کھنچے ہیں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے
پھرتے ہیں انھیں غیر ابھارے کئی دن سے

رندؔ نے چوالیس بندوں پر مشتمل ایک واسوخت بھی کہا ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے ۔ یہی واسوخت شعلۂ جوالہ جلد دوم میں بھی ص ۵۶۵ پر درج ہے ۔ بحیثیت مجموعی یہ واسوخت کوئی خاص نہیں ۔ دو چار بند قابل توجہ ہو سکتے ہیں مثلاً

جو ہوا اور قلق اِس دِلِ مضطر کے سوا
ایڑیاں رگڑیں زمیں پر کبھی سر دے ٹپکا
دیکھا جب یوں بھی تسلی نہیں ہوتی اصلا
دونوں ہاتھوں سے جگر تھام لیا اٹھ بیٹھا
کیا کہوں رات غضب لاتی ہے کیا کیا جانی
کبھی لیٹا، کبھی بیٹھا، کبھی ٹہلا جانی

ایامِ وصال کے مزے یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں،

رات دن یوں ہی رہا کرتی تھی باہم صحبت
عشق تھا تم سے مجھے مجھ سے تمھیں تھی الفت
نامِ اغیار سے صاحب کو ہوئی تھی نفرت
گھر تلک اپنے نہ جاتے تھے مرے بے رخصت
کبھی جاتے تھے تو دم بھر کے لیے جاتے تھے
جی نہ واں لگتا تھا گھبرا کے چلے آتے تھے

اور آخر میں کہتے ہیں ۔

دوستی بندے کو صاحب سے نہیں اب منظور
سمجھیے تکلیفِ ملاقات سے مجھ کو معذور
گرچہ بد وضع ہے یہ رندؔ جہاں میں مشہور
پر زمانے پہ ہے ظاہر جو مرا ہے دستور
عمر بھر پھر نہ زباں سے کبھی اقرار کیا
جب کسی بات کا ناچیز نے انکار کیا

رندؔ کے کلیات میں قطعات کافی ہیں اور ہر قطعہ رندؔ کے اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

قطعہ

جان بلب ہو گیا دو روز کی غفلت میں تری
اپنے بیمار کا احوال مسیحا دیکھا

کل تو سب کر چکے تجھے گور و کفن کی تدبیر — جانِ جاں آج تو تو نے اسے اچھا دیکھا

قطعہ

بس اب آپ تشریف لے جائیے — جو گزرے گی مجھ پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز — ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

ذیل میں رند کی زبان کی چند خصوصیتیں درج کی جاتی ہیں جن سے رند کے انفرادی رنگ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) اساتذۂ متقدمین کی تقلید میں رند بعض اوقات زبان بھی انھیں کی استعمال کرتے ہیں۔

— پرے بمعنی آگے سے

ترا دیوانہ جس وادی میں تھا اے غیرت لیلیٰ — پرے مجنوں کے جنگل سے بھی کوسوں وہ بیاباں تھا

— مانیاں بہ معنیٰ مانیں سے

منتیں مانیاں درگاہوں میں چلّے باندھے — پر میسّر نہ ہوا ساتھ سُلانا تیرا

— قدم ڈِگنا بہ معنیٰ پاؤں کانپنا سے

ہر گام پہ ڈِگتا ہے قدم راہِ وفا میں — کھائی ہے جھپیٹ ایسی کہ سنبھلا نہیں جاتا

— تلے بہ معنیٰ نیچے سے

بعد مُردن ہوئے مدفون شجرِ گل کے تلے — کس کو معلوم تھا یہ ہوگا مآلِ بلبل

— کہیو بہ معنیٰ کہنا سے

کچھ زبانی کہیو فرطِ شوق سے — خط تو اے قاصد لکھا جاتا نہیں

— بھچک بہ معنیٰ ششدر سے

شرمگیں آنکھ کسی گل نے دکھلائی نہ ہو — رہ گئی ہے وہ بھچک نرگسِ شہلا ہو کر

— ہر پھر کر یعنی پھر پھرا کر سے

پھر اسی دشمنِ جاں سے یہ ملا ہر پھر کر — دل ہمارا نہ کسی اور سے بہلا دیکھو

— سری بہ معنیٰ نوک سے

اے کماں دار مرے سینے سے سب تیر نکال — دل میں جو ڈوب گئی ہے وہ سری رہنے دے

—— اندھیاری بہ معنی اندھیری ؎

دن وصل کا موقوف تھا تاریک شبوں پر اندھیاری بھی اد غیرتِ شمس و قمر آئی

(۲) بول چال کا صحیح نقشہ اتارنے کے لیے رندؔ صرف و نحو کا خیال نہیں کرتے بلکہ جو محاورہ جس طرح بولا جاتا ہے اسی طرح نظم کر دیتے ہیں۔

—— اگلی بہ نسبت بہ معنی بہ نسبتِ سابق ؎

مریض آپ کے فی الجملہ رو بصحت ہیں سنا ہے اگلی بہ نسبت تو کچھ بحال ہوئے

—— قلق سا قلق بہ معنی بے حد قلق ؎

ہے قلق سا قلق میرے دل کو دم کی مہمان جانِ مضطر ہے

—— جب نہ تب بہ معنی ہمیشہ ؎

جب نہ تب اک نہ اک بہانہ کیا تیری بدخو یہ حیلہ جو نہ گئی

—— آٹھویں ساتویں بہ معنی آٹھویں ساتویں دن ؎

نہ وہ صحبت نہ وہ الفت نہ مدارات رہی آٹھویں ساتویں کی مجھ سے ملاقات رہی

(۳) بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ملتا ہے مثلاً

—— دوزخ ۔ مذکر

یہ بھی احسان ہے تیرا جو دیا دوزخ بھی میرے اعمال کی تو یہ بھی مکافات نہ تھی

—— جان ۔ مذکر

مجھے دے کے دل جان کھونا پڑا ہے غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے

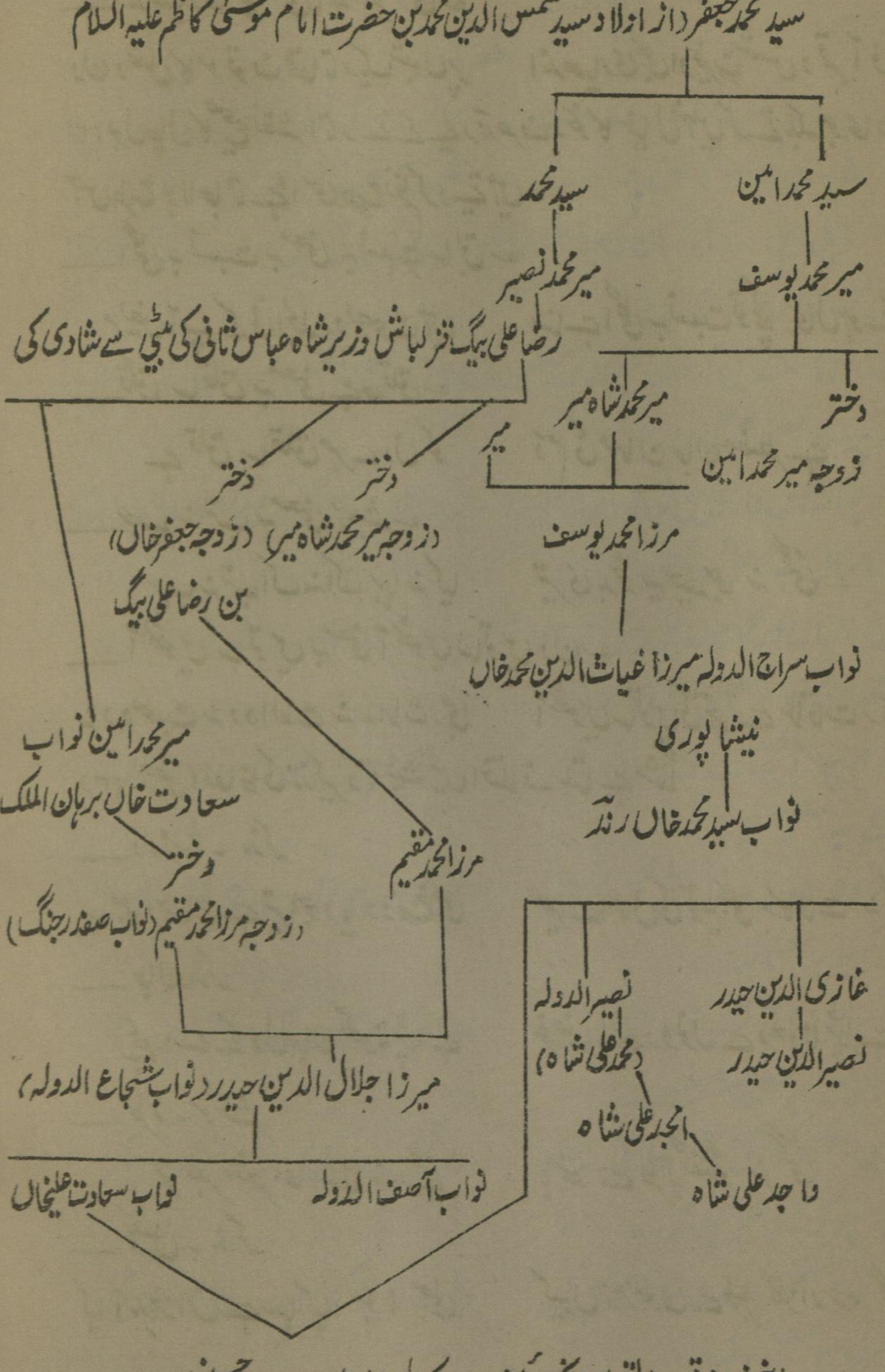
—— طرز ۔ مؤنث

عمر بھر شعر عاشقانہ کہے ہاتھ سے طرزِ گفتگو نہ گئی

—— بلبل ۔ مذکر

کیا آمدِ خزاں ہے صبا کیا ہوا چلی کیوں زمزموں سے بلبلِ گلزار رہ گیا

شجرۂ رندؔ



ماخوذ از قیصر التواریخ مؤلفہ سید کمال الدین حیدر حسینی

زاہدؔ

میرزا زاہدالدین نام زاہدؔ تخلص تھا۔ یہ میرزا کام بخش خلف شاہزادہ سلیمان شکوہ کے فرزند تھے۔ لکھنؤ میں دہلی کے شاہزادوں کا خاندان جو تھا اس کے ایک رکن تھے[1] آخر دم تک لکھنؤ میں ہی قیام رہا۔ فن شعر و سخن میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[2]۔ زبان کے رسیا اور صاحب دیوان تھے[3] مگر بہت کوشش کے باوجود ان کے دیوان کا سراغ نہ لگ سکا صرف چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں جو رنگ سخن سمجھنے کے لیے حاضر خدمت ہیں۔

طرزیں بناؤ کی یہ فقط ہیں برائے دل — کیوں کر نہ اس پری پہ بھلا اپنا آئے دل
چھوٹ جائے جان زلفِ شبِ غم کے دام سے — اپنی کشش سے اس کو اگر کھینچ لائے دِل
اس برق وش کے عشق میں کیا جان کھوئیے — ہردم جو بات بات میں اپنا جلائے دِل
بے وجہ تیرے دامِ محبت میں اے پری — دیوانہ ہے جو بیٹھے بٹھائے پھنسائے دِل
بندِ نقاب یار ہوا سے جو کھل گیا — شاید کہ مستجاب ہوئی ہے دعائے دل

ایک دم میں ملتفت نہیں ہوتا وہ بے وفا
زاہدؔ سنائیں کس کو یہ ہم ماجرائے دِل[4]

سالکؔ

میر مصطفیٰ بخش نام اور سالکؔ تخلص تھا خواجہ باسطؔ کے نواسے تھے اور شعروسخن

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۴۱۶۔ [2] تذکرہ سخن شعراء ص ۲۰۰۔
[3] تذکرہ سراپا سخن ص ۲۰۰۔ [4] جلوۂ خضر حصہ دوم ص ۲۷۲۔

ہیں خواجہ آتش سے اصلاح لیتے تھے[1] اس سے زیادہ اِن کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ چند اشعار خوش معرکہ زیبا سے نقل کیے جاتے ہیں:

مجھے بحرِ محبت مثلِ موسیٰ راہ دیتا ہے
مقید ہوں نہ کشتی کا نہ میں پابند ہوں پل کا

ہوا جب عشق کامل حسن پھر ایذا نہیں دیتا
جلایا آشیانہ آتشِ گل نے نہ بلبل کا

ہوا ہوں اک پری کے چشمِ مستانہ کا دیوانہ
مری زنجیر کا غل شور ہے شیشے کی قلقل کا

کھٹکا نہ باغباں کو نہ گل کو گراں ہوا
تقصیر کیا جو مجھ سے خفا باغباں ہوا

طفلی میں یہ اشارۂ گیسوئے یار تھا
ہوگا بلائے بد جو یہ لڑکا جواں ہوا

غضب ہے کیوں کہو کیوں مہرباں نہیں معلوم
فریب اُس کا کسی کو یہاں نہیں معلوم

ہے کل کی بات تمھیں بات کرنہ آتی تھی
کہاں سے ایسے ہوئے بدزباں نہیں معلوم

اچھا کیا جو منہ کو چھپایا نقاب میں
سو سو طرح کے لطف ہیں تیرے حجاب میں

اے بحرِ حسن تو جو نہاتا ہے بحر میں
دریا نہیں سماتا ہے چشمِ حباب میں

سخن

منشی رام دیال نام اور سخن تخلص تھا۔ والد پریم سکھ ایک اچھے گھڑی ساز تھے۔ سخن خود بھی رام دیال گھڑی ساز کے نام سے مشہور تھے۔ لکھنؤ کے قدیم باشندے اور پرانی وضع کے دلدادہ تھے۔ نہایت ذہین اور طبّاع شاعر تھے فارسی میں اچھا ملکہ رکھتے تھے۔ فارسی شعر و سخن میں ملا علی اکبر شیرازی سے شرف تلمّذ حاصل تھا[1] اور اردو شاعری میں خواجہ آتش کو اپنا استاد مانتے تھے[2]۔ شیام سندرلال برق نے

---

[1] تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص ۵۸ بہ [2] تذکرہ شعرائے ہنود ص ۱۹۵

تذکرۂ بہارِ سخن (شعرائے ہند) میں سخن کو ناسخ کا شاگرد بتایا ہے۔ مگر دیگر تذکرہ نگار جیسے نساخ، محسن علی محسن اور سعادت خاں ناصر سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ سخن اردو شاعری میں آتش سے اصلاح لیتے تھے۔ مصنف سراپا سخن کا بیان ہے کہ سخن صاحب دیوان تھے۔ ان کا دیوان نہ دستیاب ہو سکا۔ چند غزلیں خوش معرکہ زیبا میں اور چند غزلیں تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود میں مل جاتی ہیں۔ دستیاب شدہ کلام میں بلند جذبات اور شاعرانہ تخیل کا فقدان ہے۔ کلام رنگین اور رعایتِ لفظی اور صنائع و بدائع سے آراستہ ہے ملاحظہ ہو:-

خدا کے واسطے سن اے صنم گلہ دل کا — کہ تیری آنکھوں نے لوٹا ہے قافلہ دل کا
نگاہِ یار سے بچنا ہے اے سخن دشوار — پڑا ہے دشمنِ جاں سے مقابلہ دل کا

رکھے اگر وہ ناز سے اندر چمن کے پاؤں — سب پھول چومیں آن کے اُس گل بدن کے پاؤں
اب ضعف سے قدم کبھی اٹھانا محال ہے — فرقت میں ہو گئے ہیں مرے لاکھ من کے پاؤں
آنکھوں کو تیری دیکھ کے بھولے ہیں چوکڑی — اٹھتے نہیں ہیں دیکھ لے ظالم ہرن کے پاؤں

الٰہی آئے مرے پاس اب وہ جانِ جہاں — بہت خراب ہوا ہے معاملہ دل کا

ملتے ہو غیروں سے اب میرا بلانا کیسا — پھیر لی آنکھ تو پھر آنکھ ملانا کیسا
جب کہ بے پردہ ہوئے مجھ سے تو کیسا یہ حجاب — منہ دکھا کر کے دوپٹے میں چھپانا کیسا

جس کو دیکھا ستم چرخ سے پُر غم دیکھا — ہم نے عالم میں نہ کوئی دلِ خرّم دیکھا
خون رُلایا مجھے اے یار تصوّر نے ترے — بلبل و گل کو کبھی ہم نے جو باہم دیکھا

لہ تذکرہ شعرائے ہنود ص ۱۹۵

اٹھ گیا محفلِ خوباں سے جو وہ عیسیٰ دم ہم نے ہر آئینۂ رخسار کو بے دم دیکھا
میں وہ مجنوں ہوں کہ عالم نے مرے بعدِ فنا رات دن خانۂ زنجیر میں ماتم دیکھا

دم ہر اک بلبل کا پھڑکا ہے تری تقریر پر عاشقِ شیدا ہوں ہر گل تری تصویر پر
اس کے کوچے کے گدا ہوں کیوں نہ مستغنی مزاج خاکِ پائے یار رکھتی ہے شرف اکسیر پر

صورتِ ناقوس کرتا ہوں میں نالے رات دن
پڑ گئی ہے آنکھ جب سے اُس بتِ بے پیر پر

سرؔور

خواجہ ولایت علی خاں نام، سرؔور تخلص تھا۔ آپ کے والد حکیم محمد جعفر مخمورؔ، مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ سُرؔور کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ مگر ان کے والد کشمیر کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔

فنِ شعر و سخن میں سرؔور ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر میر کلّو عرشؔ سے رجوع کیا، اس کے بعد خواجہ آتشؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور آخر وقت تک آتشؔ ہی سے فیض پاتے رہے[1]۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب اودھ کی بساط الٹ گئی، اور شاہِ اودھ واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں قید کر دیا گیا، تو سُرؔور نے بھی لکھنؤ کو خیر باد کہا اور کلکتے چلے گئے، اور وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ نسّاخ کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے کلکتے کے سفر میں سُرؔور سے ملاقات کی تھی[2]۔

کلکتے کے دوران قیام میں سُرور مٹیا برج کے مشاعروں میں اور دیگر ادبی سرگرمیوں

---

[1] خوش معرکۂ زیبا ص ۵۷ہ۔ [2] سخن شعرا ص ۲۱۵۔

میں پیش پیش رہتے تھے۔ آفتاب الدولہ قلقؔ سے اِن کی شاعرانہ صحبتیں گرم رہتی تھیں۔

سُرورؔ کے سالِ وفات اور سالِ پیدائش کے بارے میں صحیح معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ مصنفِ تذکرہ یادگارِ ضیغم کا بیان ہے کہ اس تذکرے کی تصنیف کے وقت سُرورؔ کی عمر ساٹھ برس کی تھی[1]۔ اِس بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سُرورؔ ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

باوجود سعی کے سرورؔ کا دیوان نہ مل سکا۔ البتہ سُرورؔ کی ایک مثنوی ضرور دستیاب ہوئی ہے، جس کا نام یوسف زلیخا ہے یہ مثنوی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں مطبعِ نامی لکھنؤ میں طبع ہو کر شائع ہوئی تھی۔ مذکورہ مثنوی ۱۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

مختلف تذکروں میں سرورؔ کے متفرق اشعار بھی مل جاتے ہیں ان متفرقات سے سُرورؔ کے کلام کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سُرورؔ کے خیالات کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی عیاں ہے۔ اکثر اشعار درد و غم کی ترجمانی کرتے ہیں، تشبیہ و استعارہ کے پردے میں، آتشؔ کا رنگِ تغزل دکھائی دیتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

دوستی کس سے یہ کرتا ہے بڑا دیوانہ ہے　　ہے ازل سے جان کا پروانے کی دشمن چراغ

تم نہ آؤ گے نہ آؤ گے مجھے معلوم ہے　　جھوٹی سچی میرے سر کی کیوں قسم کھاتے ہو تم

کلکتہ اس کے مٹنے سے آباد ہو گیا　　کیا پوچھتے ہو لکھنؤ کے انقلاب کو

ہمارے خون کے پیاسے زمانے کے قاتل　　وہ دیکھو بزم میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

اے پری مجھ سا کبھی دنیا میں کوئی دیوانہ ہے　　گھر کے اندر میں ہوں اور باہر میرا افسانہ ہے

---

[1] یادگارِ ضیغم ص ۱۷۱۔

دخل وہ شے ہے کہ کر دیتا ہے مالک چیز کا — میرے دِل میں جلوہ گر جو ہے وہ صاحب خانہ ہے

لب ریزِ مے سے ساغر و مینا کرے کوئی — ساماں برائے یار مہیا کرے کوئی

کیوں شام بنارس کی نہ مشہور جہاں ہو — میلے کہیں دیکھے ہیں یہ دریا کے کسی نے

عشق نے تیرے کیا مجھے لاغر ایسا — میں تو سایہ سے بھی گرتا ہوں زمیں پر پہلے

آتی نہیں کسی کو بھی اصلاً نظر کمر — عنقا کی طرح گم ہے تمہاری مگر کمر

مجھے غربت میں یاد آیا جو اُس بت کا بدن دُہرا — دلِ بے صبر کو ہونے لگا رنج و محن دُہرا

دلِ عشاق پر صدمہ ہر اک ٹھوکر سے ہوتا ہے — میانِ رقص گاتا ہے جو وہ رشکِ چمن دہرا

نکلتا ہے نہ اقرار اور نہ انکار اے سرور اس میں — سوالِ وصل میں کہتا ہے وہ ایسا سخن دُہرا

اشک سے طوفان برپا ہو گیا — قطرۂ ناچیز دریا ہو گیا

اِقتباسِ مثنوی "یوسف زلیخائے سرور" مطبوعہ ماہِ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ

در مطبعِ نامی۔ بے تاب ہونا زلیخا کا غم میں حضرتِ یوسف علیہ السلام کے اور سننا غیب کی آواز کا

عجب انداز ہیں چرخِ کہن کے — نرالے ڈھنگ ہیں رنج و محن کے

عزیزِ مصر تھا خیمے کے اندر — زلیخا کا بھی خیمہ تھا برابر

یہی کہتی تھی وہ دایہ سے ہر بار — کہ دیکھوں کس طرح میں اسکا دیدار

بہت ہے دل کو اب تو بے قراری یہ حسرت کس طرح نکلے ہماری
بتا اے دایہ تو کچھ ایسی حکمت کہ جس سے دیکھ لوں میں اس کی صورت
جو دایہ نے یہ دیکھی بے قراری کہ ہے حد سے زیادہ اشک باری
کیا سوراخ پھر خیمے کے اندر کہ اُس کو دیکھ لے وہ ماہِ پیکر
قریب اپنے زلیخا کو بلایا عزیزِ مصر کا نقشہ دکھایا
نظر پڑتے ہی لب تک آئی فریاد مری مٹّی ہوئی افسوس برباد
مقابل اُس کے کب کوئی حسیں ہے جسے دیکھا تھا میں نے وہ نہیں ہے
جو تھا گردوں پہ گردش کا ستارہ پڑا اب پھر نحوست میں دوبارہ
نحوست کیا کہوں میں اِس سفر کی نہ باہر کی رہی میں اور نہ گھر کی
ہوا آغازِ الفت میں تو یہ کام اب آگے دیکھیے کیا ہوگا انجام
جو گزری حد سے اس کی بے قراری وہ سجدے میں گئی با آہ و زاری
خدا کے فضل کا پھر در ہوا باز فلک سے آئی یہ کانوں میں آواز
نہ کر بے حد زلیخا آہ و افغاں تری عصمت کا خالق ہے نگہباں
یہ تیرا مطلبِ دل گو نہیں ہے مگر حاصل اسی سے بالیقیں ہے
اسی سے سب پتا تجھ کو ملے گا اسی سے غنچۂ خاطر کھلے گا
نہ کر تو اِس کی صحبت سے کنارہ چمک جائے گا مطلب کا ستارہ
صدائے غیب سنتے ہی زلیخا بجا لائی وہ شکر اپنے خدا کا
ہوئی موقوف اس کی آہ زاری گئی وہ دل کی ساری بے قراری

لے جانا مالک کا حضرت یوسف علیہ السلام کو غسل کے واسطے کنارے دریائے نیل کے وہاں سے شاہ کے پاس لے جانا۔

پلا دے ساقیا! جلدی سے اِک جام کہ جاتا ہے نہانے کو دل آرام
نہانے پر ہوا یوسف جو تیار کنارے نیل کے پہنچا وہ اک بار
نہانے وہ لگا دریا پہ آکر کہ تھا دربار میں جانا نہا کر

نہا دھو کے جو کی رفعِ کدورت — فرشتے سے بھی نکلی بڑھ کے صورت
لباس اس کو تکلف کا پنہایا — اور اس پر عطر تتنے کا لگایا
رکھا تاجِ مرصّع اس کے سر پر — لپیٹا ایک پٹکا بھی کمر پر
وہاں تھی تاب کس کو ہم سری کی — جگہ کی فیل پر رشکِ پری کی
جہاں پر جلوہ گر تھا مصر کا شاہ — وہیں پر جا کے اُترا غیرتِ ماہ
حسینوں کا وہاں تھا ایک میلا — قریبِ شہ تھا لوگوں کا جھمیلا
وہاں ہاتھی سے یوسف کو اتارا — بنا میدانِ محشر شہر سارا
سبھوں نے جب کہ دیکھا اس کا دیدار — لگے کہنے کہ ہے کچھ اس میں اسرار
کبھی دیکھا نہیں ایسا بشر ہے — خدا کی شان اس میں جلوہ گر ہے
اُسے پھر دیکھ کر کہنے لگا شاہ — نہیں انسان یہ واللہ باللہ
حسیں جتنے وہاں تھے ماہ طلعت — خجالت سے انھیں تھی ایک حیرت

سرورؔ

غلام مرتضیٰ خاں نام اور سُرورؔ تخلّص تھا۔ والد کا نام نصیر اللہ خاں تھا جو عرب کے ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بزرگوں کا وطن مدینہ منورہ تھا۔ مگر ان کے والد ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ سرورؔ لکھنؤ میں ہی پیدا ہوئے اور یہیں انتقال کیا۔ فن شعر و سخن میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے[1]۔ سید محسن علی محسنؔ کا بیان ہے کہ وہ صاحبِ دیوان تھے[2]۔ مگر تلاش کے باوجود ان کا دیوان کہیں نہیں ملا۔ ایک غزل تذکرہ سراپا سخن میں درج ہے جو نمونے کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔

مجھ سے جو پوچھتا ہے کوئی ماجرائے دل — یہ کہہ کے لوٹ جاتا ہوں میں ہائے دل

۱؎ سخن شعرا، ص ۲۱۵۔ ۲؎ سراپا سخن ص ۲۵۷۔

ایسا گداز ہے تپِ فرقت سے ہجر میں — ساتھ آنسوؤں کے ڈر ہے کہیں بہہ نہ جائے دِل
ایسی بہار جلوۂ داغِ جگر سے ہے — فردوس کی فضا سے سوا ہے فضائے دِل
ہاتھوں سے آسماں کے ہیں اہلِ زمیں خراب — افسوس اِس نے خاک میں کیا کیا ملائے دِل
نام آشنائے خلق جہاں میں وہ ہو گیا — اِس خاکسار سا جو ہوا آشنائے دِل
اللہ بد بلا سے بچائے اسے سُرورؔ — دنیا میں کوئی شے نہیں بہتر سوائے دل

سلیمؔ

میر عباس نام اور سلیمؔ تخلص تھا۔ میر عالم علی کے بیٹے تھے۔ خواجہ کے عزیز اور ممتاز شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے[1]۔ آغا جو شرفؔ نے سلیمؔ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

بس اب میر عباس کا سنیے حال — یہ شاعر ہیں عالم خجستہ خصال
سلامت روؤں میں تخلص سلیمؔ — یہ شاگردِ آتشؔ ہیں نامی قدیم
کروں کیا بیاں اِن کی توصیف کے — کلام اِن کا قابل ہے تعریف کے
کہی جو غزل وہ کہی انتخاب — جہاں پڑھ گئے پڑھ گئے لاجواب[2]

سلیمؔ کی پیدائش کی تاریخ نہیں معلوم ہو سکی۔ ۱۲۸۲ھ میں انتقال کیا تھا[3]۔ اِن کے شاگرد میرزا علی عالیؔ نے ذیل کا قطعۂ تاریخ کہا تھا جس سے اِن کا سنِ وفات نکلتا ہے[4]

مجمعِ اوصاف و خوبی حضرتِ استاد تھے — اُن کی رحلت پر کرے کیوں کر نہ ہر دل حیف حیف
مصرعِ تاریخ عالیؔ نے کہا بے ساختہ — "میر عباسِ سلیمؔ اوستادِ کامل حیف حیف"

۱۲۸۲ھ

مصنفِ خم خانۂ جاوید کا بیان ہے کہ "غدر سے پیشتر عالم شباب میں انتقال کیا"[5] مگر یہ

---

[1] سخن شعرا ص ۲۲۰۔ [2] افسانۂ لکھنؤ ص ۱۴۲۔ [3] غنچۂ رمز در دیوان عالیؔ ہ ۱۳۰۶ھ مطبع مینائی لکھنؤ ص ۱۶۰۔ [4] خم خانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۳۵۔

درست نہیں ہے۔ مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ غدر کے بعد بھی عرصے تک سلیم بقید حیات تھے۔

مصنف تذکرۂ سخنِ شعراء اور مصنف سراپا سخن کا بیان ہے کہ یہ صاحب دیوان تھے کوئی دیوان دست یاب نہ ہو سکا۔ کچھ اشعار مختلف تذکروں میں مل جاتے ہیں جو پیشِ خدمت ہیں:

روزنِ دیوار انجم، ماہِ تاباں خشت ہے ۔۔۔ چاندنی ہر وقت رہتی ہے میانِ کوئے دوست
یہ زمیں وہ ہے کہا آتشؔ نے جس میں اے سلیمؔ ۔۔۔ اے خوشا طالع تمھارے ساکنانِ کوئے دوست

یار کا حاضر و غائب میں رہا ہم پہ عتاب ۔۔۔ گالیاں منہ پہ کبھی دیں کبھی کوسا دِل میں
دیر و کعبہ میں نہ رہے شیخ و برہمن جویا ۔۔۔ ہم نے گھر بار ترا ڈھونڈ نکالا دِل میں

گیسو کا تمھارے لقب اعجاز نما ہے ۔۔۔ بل کھائے تو اژدر ہے نہ کھائے تو عصا ہے

بے اثر عشق اگر ہو تو وہ زائل ہو جائے ۔۔۔ ایسے ہونے سے تو بہتر ہے نہ ہونا دل میں
کہتے ہو اور کو چاہو نہ مجھے تم چاہو ۔۔۔ جانتا ہوں نہ بُرا مانیو اچھا دل میں
بزم ساقی کی مجھے یاد دلاتی ہے بتو! ۔۔۔ ساغر آنکھوں میں پھرا کرتا ہے شیشا دِل میں
نامہ یار سے لینا تھا جوابِ نامہ ۔۔۔ کچھ تو کہتا تھا کوئی سوچ کے فقرا دل میں
وائے قسمت نہ ہوا یار بغل گیر سلیمؔ ۔۔۔ رہ گیا عید کو ارماں مرے دل کا دِل میں

یار آیا ہے نظر خواب میں بعدِ مدت ۔۔۔ کھولیو چونک کے غافل نہ خبردار آنکھیں

قطعۂ تاریخ وفات میر وزیر علی صباؔ

پسندیدہ گلزارِ خلدِ بریں ۔۔۔ صباؔ شاعرے منتخب لاجواب
چو شد بے صباؔ بوستانِ سخن ۔۔۔ بگو بے صباؔ شد گلستاں خراب

۱۲۷۱ھ

شاہی

شاہزادہ انوار الدین نام اور شاہی تخلص تھا۔ میرزا کام بخت کے بیٹے اور میرزا سلیمان شکوہ سلیمان کے پوتے تھے جو اکبر شاہ ثانی کے بھائی تھے۔ فنِ شعر و سخن میں پہلے میر مظفر حسین ضمیر سے رجوع کیا اس کے بعد حضرت آتش کے شاگرد ہو گئے[1] ان کا وطن دہلی تھا۔ مگر ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے[2] ان کی پیدائش اور وفات کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔

مصنفِ سراپا سخن کا بیان ہے کہ یہ صاحبِ دیوان تھے[3]۔ مگر ان کا دیوان کہیں نہیں دستیاب ہوا۔ ایک رسالہ موسوم بہ علمِ حیدری اِن کی تصنیف ہے[4] یہ رسالہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ مختلف اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔ کلام اگرچہ سلاستِ بیان کا ایک اچھا نمونہ ہے مگر سوز و گداز اور گرمیٔ عشق سے خالی ہے۔ چند اشعار نذرِ ناظرین ہیں۔

ملو گلے سے تو جاتا رہے گلہ دل کا — تمہارے وصل پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
نہ کیوں کہوں ترے ابرو ہیں غیرتِ شمشیر — کیا ہے ایک اشارے میں فیصلہ دل کا

مژدہ باد اے مے پرستو میکدہ کا در کھلا — خم سرِ شیشہ کھلا شیشہ سرِ ساغر کھلا

انساں چلے وہ چال جو ہووے جہاں پسند — مہماں سے ہو وہ کار جو ہو میزباں پسند

یہ اُس کی زلف میں جاتا ہے خیر ہو یا رب — ہوا ہے کالی بلا سے مقابلہ دل کا
نہ دید کبھی کسی گل کی ہوئی خزاں آئی — رہا ہے دل ہی میں شاہی کے ولولہ دل کا

---

[1] خوش معرکہ زیبا ص ۳۶۴۔ [2] سراپا سخن ص ۲۷۹۔ [3] ایضاً۔ [4] خم خانہ جاوید جلد چہارم ص ۷۴۔

خمسہ

رنگ لائی ہے عجب ہمتِ مردانۂ عشق　　داغ پہ داغ دیئے فرض ہے شکرانۂ عشق
روشِ فرشِ گلی ہے دلِ دیوانۂ عشق　　کیوں نہ قبضے میں ہو میراثِ پری خانۂ عشق
رونقِ باغِ جہاں سبزۂ بیگانۂ عشق

غیرتِ قصۂ بلقیس ہے افسانۂ عشق　　کس طرح قصرِ سلیماں نہ ہو ویرانۂ عشق
کیوں نہ زیبا ہو اُسے شوکتِ شاہانۂ عشق　　کیوں نہ قبضے میں ہو میراثِ پری خانۂ عشق
خلف الصدق جنوں ہے دلِ دیوانۂ عشق

شائق

لالہ سیوا رام نام اور شائقؔ تخلص تھا۔ فن شاعری میں پہلے مرزا علی نقیؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ اُس کے بعد مصحفیؔ کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ آخر میں خواجہ آتشؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا[1]۔ آتشؔ اور ناسخؔ کی معاصرانہ ادبی چشمک میں یہ خواجہ صاحب کی طرف سے بہت بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے۔ شیخ ناسخؔ کی ہر غزل کا جواب کہنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ جب ناسخؔ کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہا ؎

کہہ رہا ہے ایک جاہل میرے دیواں کا جواب　　بو مسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب
کیا کلیم اللہ سے نسبت ہے اُس ناپاک کو　　چاہیے فرعون کو دے اپنے ہاماں کا جواب

اس کے جواب میں خواجہ صاحب نے یہ مطلع کہہ کے کسی شاگرد کے نام سے مشہور کر دیا ؎

چاہیے مومن کو دے اُس نامسلماں کا جواب　　جو کہے دیواں کو اپنے ہے یہ قرآں کا جواب

اور اس طرح یہ چشمک طول پکڑتی گئی۔

اس سے زیادہ شائقؔ کے بارے میں علم نہ ہو سکا۔ چند اشعار جو تذکرۂ خوش معرکہ زیبا میں ملے ہیں وہی ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں:

---

[1] خوش معرکہ زیبا۔ ص ۶۳ ،۴ ۔

وقارِ انساں کا کھو دیتا ہے آخر خندۂ بیجا   دہن ہوتا ہے کشادہ عیب ہے موتی کے دانے کا

حسینوں پر ازل سے دل ہے مجھ دیوانے کا پھڑکا
کھلونے تھے مرے مٹی کی پریاں جب میں تھا لڑکا

تخمِ الفت ہو کے پامالِ حسیناں ہو گئے   مل گئے مٹی میں شایق اپنی دانائی کے ساتھ

بام پر ساقیِ خوش رو ہو، بغل میں یار ہو   بادہ نوشی کا مزہ جب ہے شبِ مہتاب میں
کاٹتا ہوں میں تڑپ کر جس طرح سے روزِ ہجر   یہ قلق ہوتا نہیں شب کو دلِ سرخاب میں
ابلہی ہے ڈھونڈتا زیرِ فلک آسودگی   گاؤ کو فربہ نہ دیکھا خانۂ قصّاب میں

اپنے گریے سے دلِ یار نہ تازہ پایا   کون سا کھیت ہرا اور نہ ہوا باراں سے
تو زمیں پیٹنے کے ہر گز نہ ملی وہ لذّت   جو حلاوت کہ اٹھائی ہے لبِ جاناں سے
ہم غریبوں کی خبر یار کو کیا ہو شائقؔ   کون کرتا ہے بیاں حالِ گدا سلطاں سے

سلسلہ مجنوں سے جا ملتا ہے مجھ آزاد کا   چرمِ آہو بید کی پتّی چھڑی رومال ہے
اس قدر سودا ہے کس کی زلف کا شایق مجھے   نوک نشتر کی طلب کرتی رگِ قیفال ہے

شرآر

سید علی رضا نام اور شرآر تخلص تھا۔ بلگرام ضلع ہردوئی کے رہنے والے تھے۔ فن شاعری میں خواجہ آتش سے اصلاح لیتے تھے[1] تاریخِ پیدائش کے بارے میں کچھ نہیں

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد چہارم ص ۸۷۴۔

معلوم ہو سکا۔ ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا[1]۔ صاحبِ دیوان تھے مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں غیر مطبوعہ مکمل دیوان ضائع ہو گیا۔ تذکرۂ خم خانۂ جاوید جلد چہارم میں صرف دو شعر ملتے ہیں وہ پیشِ خدمت ہیں:

ذبیحِ تیغِ نگاہِ قاتل بہ شکلِ بسمل پھڑک رہا ہے
لبوں پہ دم ہے کھلی ہیں آنکھیں اجل رسیدہ پھڑک رہا ہے

فدا تھا آگے میں گل سے رخ کا اب آنکھوں کو عشق ہے مژہ کا
گئی وہ سر سے ہوائے گلشن مگر یہ کانٹا کھٹک رہا ہے

شررؔ

مرزا آغا حسن نام اور شررؔ تخلّص تھا۔ فیض آباد کے رہنے والے تھے مگر ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ والد کا نام آغا محمد تھا۔ آغا حجّو شرفؔ نے شررؔ کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

جو آغا حسن ہیں عقیل و لبیق — سخن آور و با مروّت خلیق
یہ شاگرد آتشؔ کے ہیں خود سیر — تخلّص اسی وجہ سے ہے شررؔ[2]

مصنّف تذکرہ سخنِ شعراء کا بیان ہے کہ صاحبِ دیوان تھے۔ ان کا دیوان دستیاب نہیں ہوا۔ چند غزلیں مختلف تذکروں میں مل جاتی ہیں۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سلاستِ بیان اور بندشِ الفاظ میں مثل اپنے استاد کے جولانیاں دکھانے میں مشّاق تھے۔ عشق و محبت کے جذبات موثّر اور دلکش انداز میں نظم کرتے تھے۔ کلام تصنّع اور تکلّف سے پاک ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد چہارم ص ۴۸۸۔ [2] افسانۂ لکھنؤ ص ۱۴۲۔

کچھ بھی مجھے نظر نہیں آتا سوائے دوست   عالم کو دیکھتا ہوں جو وحدت کی آنکھ سے

زلف میں چاہنے والوں کے دلِ زار بندھے   ایک رسی میں نظر آئے گنہ گار بندھے
شاعروں پر ابھی احوالِ عدم کھل جائے   تیرا مضمون اگر اے کمرِ یار بندھے
اے صنم شیخ و برہمن ہیں گرفتار ترے   ایک زنار میں ہیں کافر و دیں دار بندھے
اے شرر کچھ تو نئی بات کسی شعر میں ہو   لطف کیا ایک ہی مضمون جو ہر بار بندھے

ہم سے خزاں رسیدوں کی جانب ہو کیا کوئی   رہتا نہیں ہے پردہ جہاں گھر میں گھر ہوا

اس قفس میں پھر نہ ایک دم جی لگے   آنکھ سے اوجھل اگر صیاد ہو

لے گیا دل بتِ مہر و وفا کے گھر میں   روشنی کرتے ہیں ہم روز خدا کے گھر میں
جا کے پھر آنے کو انسان کا کیا جی چاہے   سیرِ فردوس ہے اُس حور لقا کے گھر میں

ہم بھی نگاہِ لطف کے امیدوار ہیں   مشفق ادھر بھی دیکھیے شفقت کی آنکھ سے

پوچھو نہ کبھی جو دم فنا ہو   تم کیسے ہمارے آشنا ہو
کرتے ہو یہ کس سے جھوٹے وعدے   اس سے کہو جو نہ جانتا ہو

بوئے صندل کی جو پیدا میری مشتِ خاک نے   مار ڈالا مجھ کو کس کی صندلی پوشاک نے
اے شرر جس دم کوئی جھونکا ہوا کا آ گیا   کوئے جاناں کے کیے چکر ہماری خاک نے

ایسے کہاں نصیب کہے آ کے نامہ بر   یہ خط لو اور ابھی مجھے اس کا جواب دو

مے کش ہوں روزِ حشر کہوں گا یہی شرؔف　　پیاسا ہوں مجھ کو ساقیِ کوثر جواب دو

شرؔف

سید سادات حسین خاں نام اور شرؔف تخلص، عرفیت آغا حجوؔ۔ والد کا نام سید محمد عرف میرن صاحب تھا۔ بزرگوں کا وطن مشہد مقدس۔ مگر ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ فنِ شعر و سخن میں حضرت آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[1]۔

شرؔف کے نام میں بہت اختلاف ہے۔ رام بابو سکسینہ ان کا نام سادات حسین خاں عرف آغا حجوؔ لکھتے ہیں[2]۔ مثنوی افسانہ لکھنؤ کے ترقیمے کی عبارت میں سیادت حسن سید جلال الدین حیدر خاں عرف آغا حجوؔ تحریر ہے[3] لیکن ناصر لکھنوی نے خوش معرکہ زیبا میں ان کا نام سید باقر علی عرف آغا حجوؔ اور تخلص شرؔف لکھا ہے اور دیوانِ گلدستۂ شعرا[4] (مطبوعہ ۱۸۵۹ء) میں ان کا نام سادات حسین خاں عرف آغا حجوؔ رضوی اور تخلص شرؔف لکھا ہوا ہے میرے خیال میں دیوانِ گلدستۂ شعرا کو دیگر کتابوں پر ترجیح دینا چاہیے کیوں کہ مذکورہ گلدستہ انھیں کی زندگی میں طبع ہوا ہے۔

شرؔف واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کے سمدھی یعنی ولی عہد مرزا حامد علی کوکب کے خسر تھے، اور ولی عہد کے لڑکے بڑے میرزا اور ننھے میرزا انھیں کی بیٹی کے بطن سے تھے ۱۸۵۷ء کے بعد جب کہ اودھ کا خاندانِ شاہی ٹیا برج کو روانہ ہوا تو یہ بھی ولی عہد کے ساتھ کلکتے چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ ولی عہد کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا تھا شرؔف کو داماد کے جوان گزر جانے کا دلی صدمہ تھا، جو اُن کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔

اپنی تصنیف افسانہ لکھنؤ میں شرؔف نے خود اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:۔

---

[1] سخن شعرا ص ۲۴۴۔ [2] تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ ص ۲۹۳۔ [3] نیا دور اگست ۱۹۵۷ء ص ۵۷۔ [4] دیوان گلدستۂ شعرا ۱۸۵۹ء لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری۔

سنو صاحبو! ہے مرا تو یہ حال | کہ میں تو گنہ گار ہوں بال بال
اِک ادنیٰ میں بندہ ہوں اللہ کا | ہوا خواہ واجد علی شاہ کا
زمانے میں مشہور شاعر ہوں میں | وطن میں نہیں ہوں مسافر ہوں میں
سدا سے تخلص ہے میرا شرف | وہ مشہور و معروف ہے ہر طرف
مزہ دل کو ہے ذوق ہے غش ہوں میں | ہمیشہ سے شاگردِ آتش ہوں میں
مرا آغا حجو بھی ہے ایک نام | ازل سے ہوں شیرِ خدا کا غلام
صحیح النسب ہے مرا خاندان | ریاست سیادت بہم ہیں یہاں
عجب بات دل میں یہ آئی مرے | یکایک یہ دل میں سمائی مرے
حقیقت اودھ کی جو تھی نظم کی | یہ کلکتے میں مثنوی نظم کی
ہزار اور دو صد پہ نوے تھے سال | کیا نظم کل حال ماضی و حال

۱۲۹۰ ہجری

ہوئی جب مجھے نام کی جستجو | کہا دل نے "افسانۂ لکھنؤ"
کیا نظم سب قصۂ جنگِ غدر | لکھا بد معاشوں کا نیرنگِ غدر

شرف کا سالِ پیدائش اور سالِ وفات معلوم نہ ہو سکا۔ مثنوی طلسم لکھنؤ کا سالِ تصنیف ۱۸۷۳ء ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۳ء کے بعد کسی سال انتقال کیا ہوگا۔

شرف صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان مطبع جعفری واقع نخاس میں شائع ہوا تھا۔ یہ دیوان ۴۷۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس کے علاوہ ایک مثنوی (افسانہ لکھنؤ) جس میں غدر کے حالات نظم کیے گئے ہیں اُن کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی ابھی تک غیر مطبوعہ ہے[1] اور پروفیسر جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے

---

[1] میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ اب یہ مثنوی (افسانہ لکھنؤ) پاکستان میں شائع ہو گئی ہے، لیکن میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

ایک مثنوی لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں شکوہ فرنگ کے نام سے محفوظ ہے۔

مثنوی افسانۂ لکھنؤ میں شرف نے حمد و نعت و منقبت کے بعد واجد علی شاہ کی مدح کی ہے لیکن جب اسی مثنوی کو شکوۂ فرنگ کے نام سے لکھا تو اس میں نعتِ رسولؐ کے بجائے حضرتِ عیسیٰ کی مدح کی ہے اور ان کی امت کے اوصاف بیان کیے ہیں، اور پھر ملکہ وکٹوریہ کی تعریف کی ہے۔ اس مدح کے بعد شرف نے انگریزی سرکار کے سامنے اپنی بدحالی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ میرا اسباب غدر میں لٹ گیا ہے۔ مجھے شاہی خزانے سے دو سو روپے پنشن کے ملتے تھے، جو مدت سے بند ہیں۔ سرکار سے ملتجی ہوں کہ پنشن بحال کردی جائے۔

شرف نے مثنوی افسانۂ لکھنؤ ۱۸۷۳ء میں ٹیابرج میں لکھی۔ اس میں کل ۱۵۱ صفحات ہیں، یہ مثنوی شاعرانہ خوبیوں سے عاری ہے۔ محض تاریخی واقعات ہیں، جو بجائے نثر کے مثنوی کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے ہر صفحے پر عموماً پندرہ سطریں ہیں۔ جناب پروفیسر نورالحسن صاحب ہاشمی لکھتے ہیں "اگر شرف اِن دیکھے اور سنے ہوئے واقعات کو نثر ہی میں لکھ دیتے، تو کہیں بہتر ہوتا۔ کئی موقعے اس بیانیہ نظم میں ایسے آئے ہیں، جہاں پر اگر یہ شعریت دکھانے پر آتے، تو انداز بیان کی بہت خوبیاں دکھا سکتے تھے (جیسے کلکتہ میں واجد علی شاہ کا اپنی ماں بھائی اور بیٹے کو رخصت کرنا) لیکن انھوں نے ایسے مواقع سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ نظم کے لحاظ سے یہ منظومہ بہت معمولی ہے۔ نہ کہیں کوئی خاص ترکیب کی ہی چستی ہے۔ نہ بندش کی درستی۔ تاریخی اعتبار سے بھی اس طویل نظم کا کوئی پایہ نہیں ہے اگرچہ شرف نے تمام واقعات اپنی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے تھے۔ لیکن عینی نظر اور شے ہے، اور بصیرت دوسری چیز ہے۔ شرف میں کوئی مؤرخانہ بصیرت نہ تھی۔ بازار میں جس طرح لوگ باتیں کرتے تھے، جو قیاس آرائیاں کی جاتی تھیں، جو رائیں عام طور پر قائم کی جاتی تھیں، شرف کی اس نظم میں اسی قسم کی رائیں اور نقطۂ نظر ملتا ہے۔ البتہ اس میں جگہ جگہ اس زمانے کے مشاہیر شعراء، ادبا، اور تاریخی کرداروں، مختلف فن کاروں، ندیموں، مصاحبوں، امیروں، اور منصب داروں کے نام آئے ہیں، ان پر حواشی اور فوائد اضافہ کردیے جائیں، تو یہ مثنوی ایک اچھے تذکرے کا کام ضرور دے

سکے گی۔[1]

آغا حجو شرفؔ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ان کی زبان سلیس، اور انداز بیان دل کش ہے بندشوں میں چستی اور تشبیہات کی دل آرائی ہے۔ ثقیل الفاظ کے استعمال سے پرہیز اور فارسی اشعار کے سرنے سے گریز کیا ہے۔ خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی صاف عیاں ہے محاورات بہت منتخب اور برمحل ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کی خاص "ٹکسالی زبان باندھتے ہیں۔

شرفؔ کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ دیر و بت کدہ و صنم و برہمن و ناقوس و قشقہ و زنار و تسبیح و مصلّٰی و زاہد و مؤذّن و واعظ، شیشہ و ساغر، ساقی، جام، صراحی وغیرہ کا ذکر (جو کہ لکھنؤ کی شاعری کا ایک روایتی عنصر بن چکا تھا) اپنے کلام میں نہیں لاتے ہیں۔ بلکہ جس شعر میں ایسے الفاظ ہوتے تھے ایسے شعر انھیں پسند نہ تھے۔

مجموعی طور پر آغا حجو شرفؔ اپنے مخصوص انداز بیان اور خیال کی دلفریبی کے باعث اپنے استاد سے زیادہ قریب تھے۔ بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اشرفؔ نے اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے لکھنؤ کے شعری مزاج کو متاثر کرنے میں دیگر ہم عصر شعرا کے ساتھ (شاگردانِ آتشؔ) مل کر ایک اہم رول انجام دیا ہے۔

شرفؔ کا جو کلام میرے سامنے ہے اس کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

خلقِ خدا ہمارے جنازے کے ساتھ ہے	کس دھوم سے چلے ہیں عدم کو جہاں سے ہم
پھر پھر کے دن کو گردِ محل تھک کے رات کو	پڑ رہتے ہیں لپٹ کے ترے آستاں سے ہم

روزِ حشر آ کے فرشتوں نے جگایا تو کیا	تم جو چونکاتے تو پھر لطف تھا بیداری کا

گلے عشاق کٹوائیں سلامت تو رہے قاتل	قیامت تک لہو کی بو نہ تری شمشیر میں آئے

---

[1] نیا دور، اگست ۱۹۵۷ء ص ۴۶۔

شرفؔ کھانا جو واں کھاؤ تو پانی یاں پیو آ کے
یہ مجھ کو مژدہ یارب یار کی تحریر میں آئے

نہ دوں گا اس کے رخسارے سے آئینے کو میں تشبیہ
یہ شیشہ ہے سکندر کا وہ پرکالہ ہے قدرت کا

آبلہ توڑے گا جو آبلہ پا میرے بعد
نجد میں یاد مجھے کر کے لہو روئے گا
پھر نہ زنجیر کی آئے گی صدا میرے بعد
کس کی طاقت ہے کہ جو نجد میں کھڑکائے گا

ہم تو ایسے چپ ہوئے اس کم سخن سے چھوٹ کر
ہو گئے تصویر غم کی پھر نہ بولے عمر بھر

کبھی جو عمر رواں کی طرح شباب چلے
ہزار موج سے بھاگا ہوا حباب چلے
حقیقتہً ہیں یہ فقرۂ وہ لاجواب چلے
جواب دے نہ سکا کوئی لن ترانی کا

یہ شکل بوسۂ ابرو نکالی
دہانِ زخم سے تلوار چومی

غنچے خجل ہیں ذکر سے اس کے تنگ دہن ہے ایسا اس کا
نام ہوا عنقائے زمانہ دھوم اڑی نایابی کی

شرفؔ ثابت قدم ٹھہرے وہ ثابت آشنا ٹھہرے
برابر امتحانِ عشق بازی میں رہے دونوں

تاریخِ رحلت استاذی خواجہ حیدر علی آتشؔ مغفور

تارکِ دنیا و لذت، قانع و گوشہ نشین
خواجہ صبر و رضا، بندۂ خاصِ خدا

بے ریا، بے نفس، بے پروا و بے حرص و ہوس — ناز بردارِ توکّل، باخدا، عزلت گزیں
پاک دامن، پاک طینت، پاکباز و پاک و صاف — محو محبوبِ خدا، جویائے ربّ العٰلمیں
عارف و مجذوب، سالک، چلّہ کش، روشن ضمیر — خاکسار و بوترابی، عاشق حبل المتیں
کربلا میں روح رہتی ہے ہوئے ہیں گھر میں دفن — زندہ دل تھے، زندۂ جاوید ہیں زیرِ زمیں
شاعرِ بے مثل و یکتا تھے وہ فردوسیِ عصر — چل بسے افسوس دنیا سے سوئے خلدِ بریں
آتش ان کا تھا تخلص نام تھا حیدر علی — تھے خدا رس، تھا انھیں دنیا سے کچھ مطلب نہیں
اے شرف تھے جلوہ فرما بوریائے فقر پہ — کرتے تھے ہر وقت تعظیم و ادب مسند نشیں
سالِ رحلت سے دو عالم میں ہیں شہرت یافتہ — حیدری مدّاح و فردوشِ فردوسِ بریں

قطعۂ تاریخ تصنیف کتاب شکوہ فرنگ مصنف شکوہ فرنگ

دو لفظی ہوئی فکر تاریخ کی — کہی جب کتابِ شکوہِ فرنگ
بیاں کر چکے ہم جو نیرنگِ غدر — کہی ہم نے تاریخ "آہنگِ غدر"

۱۲۸۰ھ

قریب پردے کے پہنچا مجھے ملی معراج — ہوئی یہ قدر مری اعتبار کے باعث
کوئی نہ مرنے کو آتا نہ نیمچہ بندھتا — یہ طمطراق ہے مجھ جاں نثار کے باعث

اس کے دیدار کی بھی ہم نے اگر کی صورت — ہوگی بے تابی میں کیا تابِ نظر کی صورت
غم میں پروانوں کے یہ حال کیا گھل گھل کر — ہم سے دیکھی نہ گئی شمعِ سحر کی صورت
جلوہ گر چار طرف ہے تری تصویر اے یار — دل کسے نذر دوں دیکھوں میں کدھر کی صورت
عشقِ گیسو میں شرف نالۂ سوزاں جو کیا — ہڈیاں ہوگئیں جل جل کے اگر کی صورت

دنیا میں کوئے یار ہے طبقہ بہشت کا — یہ سرزمیں اٹھا آئی تھی خلدِ بریں سے کب

ملتیں نہ خاک میں جو پریزاد صورتیں — نشو و نما گلوں کا یہ ہوتا زمین سے کب

گلشن میں آگ چار طرف ہے لگی ہوئی ‏ پھول اُس میں جا پڑا تھا رخِ آتشیں سے کب
لپکا ہماری آنکھ کو ہے جھانک تانک کا ‏ ہوگی موافقت کسی پردہ نشیں سے کب

دن بھر جہاں میں خاک اڑاتی ہے کیوں صبا ‏ روتی ہے کس کے واسطے شبنم تمام شب
بے خانماں نہ ہوئے گا مجھ سا بھی اے شرفؔ ‏ دن بھر تو دھوپ پڑتی ہے شبنم تمام شب

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا ‏ صبح سے شام ہوئی دِل نہ ہمارا ٹھہرا
جان پر بن گئی یار اٹھ جو گیا پہلو سے ‏ پھر نہ تھامے سے تھا دل نہ کلیجا ٹھہرا
اے شرفؔ تم سے نکیرین نے کیا پرسش کی ‏ فیصلہ قصۂ دنیا کا کہو کیا ٹھہرا

چراغِ شاعری آتشؔ کے سامنے گل تھا ‏ بس ایک گلشنِ ایجاد میں وہ بلبل تھا

حنا مل کر کفِ رنگیں جو اے غنچہ دہن دھونا ‏ اسی پانی سے زخمِ دل مرا بھی جانِ من دھونا
نکھرنا عطر مل لینا، ملا کر خاک میں مجھ کو ‏ منگا کر پھول کھنچوا کر گلاب اپنا بدن دھونا

اے شرفؔ حسن پرستی کا مزہ تھا مجھ کو ‏ دِل دیا اُس کو جسے پیار کے قابل سمجھا

دردِ دل سننے سے پرہیز ہے اُس عیسیٰ کو ‏ چاہنے والوں کے حق میں تو یہ اچھا نہ ہوا

ترے شوق میں دل کی تباہی ہوئی، ترے ذوق کی اس پہ گواہی ہوئی
کوئی دم بھی نہ لینے دیا مجھے دم، مجھے دشمنِ صبر و قرار کیا

خط جو اُس شوخ نے شنجرف سے لکھا مجھ کو ‏ اڑ گئے ہوش اسے خونِ کبوتر سمجھا

ہماری اِک ورقِ گل پہ داستاں لکھ کر — نہ پھر سنے گا یہ دلچسپ گفتگو صیاد

شمسؔ

میرزا اکبر علی نام اور شمسؔ تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور فن شاعری میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[۱]۔ شمسؔ کی ایک مکمل غزل دیوان گلدستۂ شعرا مطبوعہ ۱۸۵۹ء میں موجود ہے۔ دو شعر تذکرہ خم خانۂ جاوید جلد چہارم میں بھی مل جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کا کلام کہیں دستیاب نہ ہو سکا۔ بہم رسیدہ کلام ملاحظہ ہو۔

تیرہ بختی سے نہ دیکھی کبھی گھر کی صورت — خانہ بر دوش ہمیشہ ہوں سپر کی صورت
ضد یہ مجھ سے ہے شبِ وصل گھڑی سازوں کو — کوکتے ہیں جو گھڑی بھی تو گجر کی صورت
آئینہ تیرے مقابل ہے مجھے حیرت ہے — محو ہوں دیکھ کے دونوں میں کدھر کی صورت
شوقِ دیدار میں آئینہ بنا حیرت سے — گڑ گیا میں درِ جاناں پہ نظر کی صورت
مخبری کے لیے کاندھوں پہ معیّن ہیں مَلک — جو میں کہتا ہوں وہ سنتا ہے خبر کی صورت
داغِ دِل اور بھی چمکا ہے شبِ مہ اے شمسؔ — یاد آئی ہے جب اِک رشکِ قمر کی صورت

حرص بھی حد سے سوا سَم ہے بشر کے حق میں — زہر ہوتا ہے اگر رزق بھی کھا جائے بہت
کشتۂ تیغِ نگہ ہوں تو ہو راحت دِل کو — نیم جاں کر کے نہ قاتل ہمیں تڑپائے بہت

شناورؔ

صاحب میرزا نام اور شناورؔ تخلص تھا۔ شاہ میر خاں فیض آبادی کے بیٹے اور آغا نصیر نیشاپوری کے پوتے تھے[۲]۔ وطن فیض آباد تھا۔ مگر ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں

---

[۱] دیوان غریب ص ۴۴۴۔ اور تذکرہ سخن ص ۲۵۲۔ [۲] تذکرہ سخن شعرا ۲۵۳ صفحہ۔

آباد ہو گئے تھے۔ فن شعر و سخن میں حضرتِ آتش کے شاگرد تھے[1]۔ شناور کی پیدائش اور وفات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ یہ امجد علی شاہ بادشاہ اور واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں رہتے تھے[2]۔ مصنف خوش معرکہ زیبا کا بیان ہے کہ شناور نے جوانی میں ہی اس دنیا کو خیرباد کہا[3]۔ نساخ کا بیان ہے کہ شناور صاحب دیوان تھے[4]۔ مگر بہت کوشش اور جستجو کے بعد بھی راقم کو ان کا دیوان ہاتھ نہیں آیا۔ چند غزلیں مختلف تذکروں میں ملی ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شناور کو زبان پہ قدرت حاصل تھی۔ وہ محاورات بہت منتخب اور برمحل استعمال کرتے تھے۔ اور انداز بیان بہت موثر اور دل کش تھا۔ رکاکت اور ابتذال سے پرہیز کرتے تھے۔ تشبیہات کی لطافت آمیز سادگی ان کے کلام کا خاصّہ ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

عالم فریب حسنِ خداداد ہو گیا | وہ بُت بناؤ کر کے پری زاد ہو گیا
اِس شاعری کا حال شناور نہ پوچھیے | مصرع اِدھر کہا اُدھر استاد ہو گیا

کم نہیں فردوس سے خوبی میں ایوان یار کا | چشم حور العین ہے روزن تری دیوار کا

آوارہ نہ ہمیں ایک فقط دربدر پھرے | کیا کیا تری تلاش میں شمس و قمر پھرے
بحرِ جہاں میں سیر کو دم بھر اگر پھرے | مثلِ حباب ساتھ لیے اپنا گھر پھرے
کیا بے محل تو بول اٹھا ہے شبِ وصال | حلقوم پر چھری ترے مرغِ سحر پھرے
جاتے ہیں اب تو کوچۂ قاتل کی سیر کو | پھر آملیں گے یاروں سے جیتے اگر پھرے

بلا میں پھنسا ہوں مصیبت نئی ہے | یہ ہے عشق پہلا یہ آفت نئی ہے

---

[1] خوش معرکہ زیبا ص ۴۱۹۔ [2] خم خانہ جاوید جلد پنجم ص ۵۹۔ [3] خوش معرکہ ص ۴۱۹۔ [4] سخن شعرا ص ۲۵۳

کہاں سرگزشتِ محبت نئی ہے ۔۔۔ حکایت وہی ہے عبارت نئی ہے
تمھیں شوق جب سے ہے سیرِ چمن کا ۔۔۔ گلستاں کی ہر جا حکایت نئی ہے
گنہ گار ٹھہرا میں فریاد کرکے ۔۔۔ عجب منصفی ہے عدالت ہے
بہت تیرے مستوں سے کرتی ہے گری ۔۔۔ مئے شوق ساقی نہایت نئی ہے

مجھ کو خوش آئے شبِ فرقت میں کیوں کر چاندنی
تیرہ بختوں کو اندھیرے سے ہے بدتر چاندنی
بعدِ مدّت ہے لبِ دریا میسّر چاندنی
ابر مہلت دے تو دیکھوں آج شب بھر چاندنی

پھر شبِ عیش و طرب ہے وہی چرچا پھر ہو ۔۔۔ وہی ساقی، وہی ساغر، وہی مینا پھر ہو
پھر اُسی چال سے چلتے ہو غضب کرتے ہو ۔۔۔ خوف آتا ہے مجھے حشر نہ برپا پھر ہو

اے آئینہ رو ایک مجھی کو نہیں حیرت ۔۔۔ بُت بن گیا جس کو تری صورت نظر آئی
زلفوں سے صنم شان ہوئی کفر کی ظاہر ۔۔۔ رخ سے ترے اللہ کی قدرت نظر آئی

دیر و کعبہ میں نہ پایا جب اُسے ۔۔۔ دل کو میں سمجھا ٹھکانا یار کا
کس سے شکوہ بے وفائی کا کروں ۔۔۔ ہے طرف دار اک زمانا یار کا
ماہِ تاباں کو لگاتا ہے گہن ۔۔۔ منہ کو زلفوں میں چھپانا یار کا

یاد ہیں مجھ کو بھی عیاری کے دستور بہت ۔۔۔ آپ ہیں دور تو بندہ بھی ہے پھر دور بہت

کب ہے عریانی سے بڑھ کر کوئی دنیا میں لباس ۔۔۔ یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

ذرا سی بات پر وہ آستینوں کو الٹتے ہیں   لڑائی روز ہو جاتی ہے کپڑے روز پھٹتے ہیں

شوقؔ

حکیم تصدق خاں نام، نواب مرزا عرفیت اور شوقؔ تخلص تھا۔ حکیم نواب مرزا کے نام سے مشہور تھے۔ والد کا نام آغا علی خاں، اور چچا کا نام مرزا علی خاں تھا۔ یوں تو شوقؔ کا پورا خاندان ہی حکمت، اور طبابت میں مشہور تھا لیکن ان کے چچا مرزا علی خاں لکھنؤ کے مشہور حکیموں میں تھے، اور شاہان اودھ کے دربار میں ایک بڑے عہدے پر مقرر تھے۔ بادشاہ کی طرف سے حکیم الملک کا خطاب بھی ملا تھا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حکیم مسیح الدولہ ان کی جگہ پر مقرر ہوئے اور تاعمر اسی عہدے پر فائز رہے۔

شوقؔ ۱۷۸۳ء/۱۱۹۷ھ میں بہ مقام لکھنؤ پیدا ہوئے[۱]۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مکمل کی۔ اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور و معروف اساتذہ کی تعلیم اور فیضانِ صحبت سے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ علم طب اور حکمت پر بھی پورا پورا عبور حاصل کیا شوقؔ کی شکل و صورت اور لباس کے بارے میں مصنّف تذکرۂ شوق اس طرح رقم طراز ہیں:۔

شوق شکلاً بہت وجیہ واقع ہوئے تھے۔ بھرے بھرے گال، ستواں ناک بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، سرخ و سپید رنگ، کشادہ سینہ غرض اچھے خد و خال، بلند قامت، اور دوہرے جسم کے بزرگ تھے۔ جوانی میں شہر کے خوب صورت لوگوں میں ان کا شمار تھا۔ پیرانہ سالی میں بھی آثار رجال موجود تھے۔ البتہ کمر کسی قدر جھک گئی تھی۔ گرمیوں میں سر پر چکن کی چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ اور اس پر جالی کا رومال ہوتا تھا اور جاڑوں میں یہ ٹوپی شال کی ہوتی تھی جس پر رو پہلی فیتوں کا کام

(۱؎ اگلے صفحہ پر)

ہوتا تھا اور اس پر شالی رومال خواہ دو شالے اوڑھتے تھے، پاؤں میں برابر زرد مخملی گھیتلا جوتا ہوتا تھا۔ جب یہ مخملی جوتا کمیاب ہوگیا، تو زرد مخمل کی زیر پائی پہننے لگے تھے۔ سفید نین سکھ اور زیادہ تر اودے گلبدن کا پاجامہ پہنتے تھے اور گرمیوں میں باریک ململ یا شربتی کا انگرکھا جس میں در دامن گوٹ لگی ہوتی تھی۔ کرتا پہننا اس زمانے میں معیوب تھا۔ بنیائن اُس عہد تک رائج ہی نہ ہوئی تھی۔ کبھی کبھی خاص موقع پر نیم آستین شلوکہ جالی کے کپڑے کا، چکن یا کسی سوتی کام کا انگرکھے کے نیچے پہنتے تھے[۱]۔"

شوقؔ کے نواسے احسنؔ لکھنوی اور نواب مرزا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"حکیم مسیح الدولہ بہادر نواب مرزا صاحب سے عمر میں بڑے تھے۔ اور اپنے چھوٹے چچازاد بھائی (شوقؔ) سے بہت محبت کرتے تھے چوں کہ حکیم نواب مرزا بہت خوش باش، عیش پسند اور رنگین مزاج تھے اس لیے حکیم مسیح الدولہ بہادر نے انھیں دربار سے ہمیشہ علاحدہ رکھا۔ اور محلات کا علاج ان سے کبھی متعلق نہ کیا۔ لیکن جب اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا زمانہ آیا، تو نواب مرزا کی رسائی دربار میں پورے طور پر ہوگئی۔ نواب واجد علی شاہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے پانچ سو روپیہ ماہوار ان کا مشاہرہ مقرر تھا۔ اور انعام و اکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ حکیم نواب مرزا صاحب ایک ذی علم شخص تھے، طبیب حاذق تھے۔ اور فنون مختلفہ میں ان کا ذوق بہت اچھا تھا[۲]۔"

احسنؔ لکھنوی کا مندرجہ بالا بیان کہ شوقؔ کو واجد علی شاہ کی سرکار سے پانچ سو روپیہ

(۱ بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۲ کا) تذکرۂ شوق عطاء اللہ پالوی ص ۴۰۔ [۱] حاشیہ صفحہ ہذا۔ ایضاً۔
[۲] زہر عشق مجنوں ایڈیشن ص ۳۴۔

مشاہرہ ملتا تھا۔" عطار اللہ پالوی کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں، پالوی صاحب فرماتے ہیں:۔

حکیم احسن صاحب لکھنوی کا یہ فرمانا کہ شوقؔ واجد علی کے دربار میں نوکر تھے۔ ان کا مشاہرہ پانچ سو روپیہ تھا اور انعام واکرام کی حد نہ تھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے، کسی تاریخ، تصنیف، واقعہ یا روایت سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی، نیز اس دور کے کسی دیسی دربار میں پانچ سو روپیہ کسی شاعر کا مشاہرہ نہ ہوتا تھا۔ پھر شوقؔ کو مشاہرہ ملنے کی کیا وجہ...... واجد علی شاہ نے ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہونے کے بعد حبب رجب علی بیگ سرورؔ کو درباری شاعر مقرر کیا تو ان کی تنخواہ پچاس روپے ماہانہ مقرر کی تھی۔ پھر شوقؔ کا پانچ سو روپے کا مشاہرہ کیوں مقرر ہوتا۔[1]

راقم کو پالوی صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اگرچہ اس دور میں پانچ سو روپے کا مشاہرہ بہت بڑی بات تھی اور اتنی بڑی تنخواہ خود ناسخؔ یا بادشاہ کے استاد محمد رضا برقؔ کے حصے میں بھی نہ آئی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ شوقؔ چوں کہ شاہی معالج تھے اور پھر ان کی ادبی خدمات سے متاثر ہو کر بادشاہ نے ان کی یہ غیر معمولی تنخواہ مقرر کی ہو۔ پالوی صاحب کو اس بات سے بھی انکار ہے کہ شوقؔ کو دربار میں رسائی تھی۔ اور شوقؔ نے آبائی پیشہ اختیار کیا تھا۔ حالاں کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ شوقؔ کو بادشاہ وقت کے دربار میں نہ صرف خاص مقام حاصل تھا بلکہ شوقؔ ذاتی معالج بھی تھے۔ اور شوقؔ نے اپنا آبائی پیشہ طبابت بھی اختیار کیا تھا۔ پھر یہ میری ذاتی رائے نہیں، اس کے ثبوت میں آغا حجو شرفؔ کے "افسانۂ لکھنؤ" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ شرفؔ شوقؔ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

سرافراز نواب مرزا حکیم ۔۔۔ معالج یہ ہیں بادشاہی قدیم
حقیقت میں عیسیٔ ثانی یہ ہیں ۔۔۔ بڑے نامور خاندانی یہ ہیں

---

[1] تذکرۂ شوقؔ ص ۴۳۔

علاجوں کا عالم میں افسانہ ہے　　مطب ان کا جو ہے شفاخانہ ہے
سمجھتے ہیں عیسیٰ جو بیمار ہیں　　اسی طرح کے تجربہ کار ہیں
یہ عہدِ خلافت میں کامی رہے　　ہمیشہ عمائد میں نامی رہے
یہ شاگرد آتش کے ہیں نامور　　ظریف و جہاں آشنا، خوش سیر
قضا کی جو عبرت سے رہتے ہیں سست　　مریض ایسے ایسے کیے تندرست[1]

مندرجہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ نہ صرف شوقؔ شاہی معالج تھے اور پیشہ طبابت اختیار کیے ہوئے تھے، بلکہ اپنا مطب بھی کرتے تھے۔ اور ان کے مطب کا ہر طرف شہرہ تھا۔

جب شوقؔ نے ہوش سنبھالا تو ہر طرف شعر و سخن کی محفلیں آراستہ تھیں۔ لکھنؤ کا شعری ماحول ایک خاص رنگ شاعری میں ڈوبا ہوا تھا۔ انشاؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ وغیرہ کی محفلیں، اور معرکے اکھڑ چکے تھے۔ اور نئے دست و بازو، اور نئے ذہن کے ساتھ ناسخؔ و آتشؔ جیسے اساتذہ کا اکھاڑہ جما ہوا تھا۔ ایک طرف تلامذۂ ناسخؔ اور دوسری طرف شاگردانِ آتشؔ اپنے اپنے استادوں کی سرپرستی میں معرکے منظم کرنے اور اپنی اپنی برتری منوانے میں کوشاں و سرگرداں تھے۔ ایسے رنگین ماحول میں لکھنؤ کا ہر فرد چاہے وہ باذوق ہو، یا بے ذوق، شاعری اور شعری محفلوں سے ضرور منسلک تھا۔ شوقؔ بھی اسی معاشرے کے ایک فرد تھے، ماحول سے متاثر ہو کر شعر گوئی کی طرف رجوع ہوئے، اور مشقِ سخن کرنے لگے۔ اپنے دور کے اساتذہ میں خواجہ آتشؔ کا رنگ پسند آیا، اور انھیں کی شاگردی اختیار کی۔ ابتدا میں صنفِ غزل میں طبع آزمائی شروع کی۔ مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی آخر کار غزل گوئی ترک کر کے مثنوی کی طرف رجوع ہوئے، اور اپنی تین معرکتہ الآرا مثنویاں فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق تصنیف کیں۔ جو شوقؔ کی بقائے دائم کا سبب بنیں۔ بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ شوقؔ اور خواجہ آتشؔ میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے

---

[1] افسانۂ لکھنؤ ص ۱۸۔

تھے، جس سے بعد کو شوقؔ نے اپنے استاد سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ مگر اس بیان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے یہ بیان بھی قابلِ یقین نہیں ہے۔

مؤلفِ تذکرۂ شوقؔ کا بیان ہے، کہ شوقؔ کا مکان وکٹوریہ اسٹریٹ پر واقع اس محلّے میں تھا، جو اب پرانا بزازہ کہلاتا ہے۔ یہ مکان شارعِ عام پر واقع تھا۔ زنانہ حصہ الگ، اور مردانہ حصہ الگ تھا۔[1] شوقؔ آخر عمر تک اسی مکان میں قیام پذیر رہے۔ ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ مطابق ۳۰ جون ۱۸۷۱ء بروز جمعہ لکھنؤ میں ہی ۶۸ سال کی عمر میں اِس سرائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

اس قبرستان میں جو اس وقت ریلوے لائن کے بالکل نیچے اسٹیشن کی طرف واقع ہے اور اس مخزن الشعراء میں جس میں ۱۷۸۲ء میں سوداؔ، ۱۷۸۶ء میں میر حسنؔ، ۱۸۱۰ء میں میرؔ ۱۸۱۷ء میں انشاؔء ۱۸۲۴ء میں مصحفیؔ، ۱۸۳۸ء میں ناسخؔ، ۱۸۴۶ء میں خواجہ آتشؔ جیسے باکمال افراد سپردِ خاک ہوئے تھے ۱۸۷۱ء میں شوقؔ بھی دفنا دیے گئے۔[2]

کلام شوقؔ کو ان کی مثنویات کی وجہ سے شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ اصل میں یہی مثنویاں ہی ان کا سرمایۂ حیات ہے۔ مثنویوں کے علاوہ ان کا کلام کیا، اور کتنا تھا، اس کے متعلق صحیح طور سے نہیں کہا جا سکتا، متفرق اشعار، چند غزلیں اور ایک واسوخت اب تک دست یاب ہوئے ہیں۔

مصنّف خوش معرکہ زیبا نے شوقؔ کو صاحبِ مسدس و خمسہ بھی کہا ہے مگر کسی دوسری کتاب یا تذکرے میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ گویا ابھی تک شوقؔ کا دستیاب شدہ مکمل کلام حسبِ ذیل ہے۔

(۱) چند غزلیں اور متفرق اشعار (۲) ایک واسوخت (۳) مثنوی فریبِ عشق (۴) مثنوی بہارِ عشق (۵) مثنوی زہرِ عشق۔

غزلیات شوقؔ نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر برائے نام۔ ان کا کوئی مکمل دیوان قلمی یا مطبوعہ آج تک دست یاب نہیں ہوا۔ گمان ہوتا ہے کہ شوقؔ نے شاید

---

[1] تذکرہ شوق۔ عطاء اللہ پالوی ص ۴۱۔ [2] تذکرۂ شوق ص ۵۵۔

کوئی دیوان بھی مرتب کیا ہو، مگر چوں کہ ان کی غزلیات کا کوئی خاص مرتبہ نہ تھا، اس لیے ان کی قدر نہ ہوسکی۔ اور وہ سارا کلام ضائع ہوگیا مختلف اشعار جو مختلف تذکروں میں شامل کر دیے گئے تھے، وہی محفوظ رہے، عطاء اللہ پالوی نے مختلف تذکروں سے اکٹھا کرکے مجموعی بیالیس اشعار اپنی کتاب تذکرۂ شوق میں شامل کیے ہیں، اور یہی ان کا مکمل کلام بتلایا ہے حالاں کہ راقم الحروف نے ادھر ادھر سے تلاش کرکے مجموعی طور پر غزل کے اکٹھے اشعار ڈھونڈ نکالے ہیں، ان اشعار سے قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شوق کی غزلیات کس پائے کی ہیں یقیناً ان اشعار میں وہ رومانی اور زور نہیں ہے جو ان کی مثنویات میں ہے:۔

خیر سے موسمِ شباب کٹا — چلو اچھا ہوا عذاب کٹا[1]

چمن میں شب کو گھرا ابرِ نو بہار رہا — حضور آپ کا کیا کیا نہ انتظار رہا[2]

قاصد! یہ یاد رکھنا ان کی صورت کا پتا — بھولی بھولی شکل ہے اور پیارے پیارے ہاتھ پاؤں

پاؤں پر گرنے سے بھی جب وہ نہ آیا میرے ہاتھ — پیٹے اُکاٹے، جھٹکے، پٹکے دے دے مارے ہاتھ پاؤں

غیر کے گھر میں رہو گر کوئی واں ہو کہ نہ ہو — تمھیں بتلاؤ بُرا دل میں گماں ہو کہ نہ ہو

حالِ دل اس لیے تحریر کیا ہے میں نے — کہ مبادا کہیں قاصد سے بیاں ہو کہ نہ ہو

اُن کو اِس سادہ مزاجی پہ یہ سوجھی ہے ہنسی — سارے مکتوب میں لکھا ہے فقط سر نامہ

میں تو بدنام ہوں وہ کبھی کہیں بدنام نہ ہوں — قاصد اس واسطے لکھا نہیں ہے سر نامہ

---

[1] تذکرہ شوق ص ۵۲ ۔ [2] ایضاً۔

اب تو خط لکھتے کبھی اس شوخ کو میں ڈرتا ہوں
راہ میں کھول کے اکثر پڑھ لیتے ہیں اکثر نامہ[1]

خوش چشم ہے تو تجھ سے زمانے کی لڑی آنکھ
کس کس کی تری آنکھ کے اوپر نہ پڑی آنکھ

گل برگ ہیں لب، سیب ذقن، بال ہیں سنبل
چھوٹا ہے دہن غنچہ، نرگس سے بڑی آنکھ

بے یار گیا ہوں جو کبھی سیرِ چمن کو
کانٹا سا چبھا دل میں اگر گل پہ پڑی آنکھ

وہ کب ہے کوئی حسن جسے صورتِ تصویر
حیراں نہ رہے دیکھ کے دو چار گھڑی آنکھ

ایک ایک سے دلچسپ ہے جو عضوِ بدن ہے
رہ رہ گئی پہروں وہی جس جا پہ پڑی آنکھ

کہنے میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے
پھرتے ہیں انھیں غیرا بھارے کئی دن سے

جلوے نہیں دیکھے جو تمھارے کئی دن سے
اندھیر ہے نزدیک ہمارے کئی دن سے

ہم جان گئے آنکھ ملاؤ نہ ملاؤ
بگڑے ہوئے تیور ہیں تمھارے کئی دن سے

کس کشتہ کا کل کا رکھا سوگ مری جان
گیسو نہیں کیوں تم نے سنوارے کئی دن سے

کس چاک گریباں کا کیا آپ نے ماتم
کپڑے بھی نہیں تم نے اُتارے کئی دن سے

پھر شوق سے کیا اس بت عیار سے بگڑی
ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے[2]

آپ کی گر مہربانی ہو چکی
تو ہماری زندگانی ہو چکی

بیٹھ کر اٹھیے نہ کوئے یار سے
انتہائے ناتوانی ہو چکی

تصورِ مژۂ اشکبار باقی ہے
برس کے کھل گیا بادل بہار باقی ہے[3]

۱؎ مثنوی فریب عشق۔ مطبوعہ ۱۲۷۳ھ ص ۳۰۔ ۲؎ دیوان رند ص ۱۹۶ مخمس رند بر غزل شوق رامپوری صاحب نے صرف آٹھ شعر درج کیے ہیں جب کہ پوری غزل میں سولہ اشعار ہیں۔ ۳؎ تذکرہ شوق ص ۵۳۔

واسوخت

شوق نے اکتالیس بندوں پر مشتمل ایک واسوخت بھی کہا ہے۔ یہ واسوخت کتاب شعلۂ جوالہ حصہ دوم (مجموعہ واسوخت) مرتبہ فدا علی عیشؔ میں ص ۳۴۵ پر اور مثنوی فریب عشق مطبوعہ ۱۲۷۳ھ کے ص ۲۲ پر درج ہے۔ یہاں شوقؔ کا رنگ غزلیات کے مقابلے میں ذرا نکھرا ہوا ہے۔ بندش کی چستی، اور طبیعت کی روانی، اچھی طرح نمایاں نظر آتی ہے۔ پورا واسوخت قابل تحسین ہے۔ نمونے کے لیے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ تم شوخ جفا کار نہ تھے		تیغ ابرو کی طرح خلق کے خونخوار نہ تھے
سرِ مو شِل سرِ زلف دل آزار نہ تھے		شوخ تھے، گرم تھے، اس طرح کے طرار نہ تھے
صورتِ برق جو رخسار چمک جاتے تھے
اپنے سایے سے بھی تم آپ جھجک جاتے تھے

آگے ہر بات میں اس طرح کے چالاک نہ تھے		صید دل اتنے ترے بستۂ فتراک نہ تھے
حسن تھا طالبِ آرائشِ پوشاک نہ تھے		شرم ہر بات میں آجاتی تھی بے باک نہ تھے
عطر دولھن کا نہ اس طرح ملے رہتے تھے
بند محرم کے نہ یوں آگے کھلے رہتے تھے

اب تو ہے اور ہی کچھ چہرۂ زیبا کی بہار		دن میں آرائشِ تن ہونے لگی سو سو بار
جنبشِ ابرو پہ چل جاتی ہے دم میں تلوار		گرتے ہیں پھول سے رخسار پہ عشاق ہزار
ڈاک کی طرح سے رخسار جو ضو دیتے ہیں
عکس پڑ پڑ کے گہر کان میں لَو دیتے ہیں

اب نہ پردہ ہے نہ چوری ہے نہ شرماتے ہیں		جی جہاں چاہتا ہے آپ چلے جاتے ہیں
جس پہ دل آتا ہے گھر میں اسے بلواتے ہیں		اور جو کہیے تو ڈھٹائی سے یہ فرماتے ہیں
ہاں جی ہاں خیر سے کی ہم نے محبت تمھیں کیا
اپنا دل، اپنی خوشی، اپنی طبیعت تمھیں کیا

اب طبیعت نے اٹھایا ہے وہ صدمۂ جانکاہ   جان بچتی نظر آتی نہیں اے غیرت ماہ
شکوہ کرتا نہیں اس پر بھی ترا میں واللہ   کوئی کہتا ہے تو کہتا ہوں کہ کیا اس کا گناہ
ہو نہ غیبت یہ مناسب نہیں کہنا مجھ کو
ان کا کیا شکوہ کسی سے نہیں کہنا مجھ کو

ان کو منظور اگر غیروں سے ہے انس ووفا   ان سے ملنا نہیں منظور ہمیں بھی حاشا
گو کہ مشہور زمانے میں ہیں وہ مہر لقا   اپنے مطلب کے نہیں روز جلے کس کی بلا
کس کو مطلب ہے کہ اب ان سے ملاقات کرے
ایسے خود غرضوں سے پاپوش مری بات کرے

مثنویات دہلوی شعرا اور دہلی کی شاعری پر برتری حاصل کرنے کی کوشش نے لکھنؤ میں صنفِ مثنوی کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ جب لکھنؤ میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا ہر طرف چرچا ہونے لگا، تو لکھنوی شعراء کو اس بات کی بہت فکر لاحق ہوئی۔ اور اس کے جواب میں اس سے بہتر مثنوی کہنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ چنانچہ ناسخ نے اپنی مثنوی سراجِ نظم ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں مکمل کی۔ نسیم نے گلزارِ نسیم ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں مکمل کی، جس سے لکھنوی شعرا کی گردنیں فخر سے اوپر اٹھ گئیں۔ اس کے بعد پھر صبا نے اپنی مثنوی صیدیہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں مکمل کی خود شاہِ اودھ واجد علی شاہ نے دریائے تعشق، افسانۂ عشق اور بحرِ الفت تصنیف کر ڈالی۔ اسیر نے دُرّۃ التاج، آغا حسن نظم نے لذتِ عشق، آفتاب الدولہ قلق نے طلسمِ الفت مکمل کر ڈالی، اور پھر شوق نے اپنا سب سے بڑا شاہکار، آخری مثنوی زہرِ عشق کو مکمل کیا جس نے لکھنؤ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔

اگرچہ شوق کی اپنی صرف تین مثنویاں، فریبِ عشق، بہارِ عشق، زہرِ عشق ہی ہیں۔ لیکن بعد کو بعض مفاد پرست حضرات نے چند مثنویاں اور ان کے نام سے منسوب کر دیں جن میں حسبِ ذیل بہت مشہور ہیں، لذتِ عشق، خنجرِ عشق، سوزِ عشق، قہرِ عشق، وغیرہ وغیرہ بعض مشہور اہلِ قلم حضرات نے بھی مثنویاتِ شوق کی تعداد کے سلسلے میں ٹھوکر کھائی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے دبستانِ لکھنؤ میں شوق سے چار مثنویاں منسوب کی ہیں (۱) زہرِ عشق (۲) بہارِ عشق، (۳) فریبِ عشق (۴) لذتِ عشق، مولانا حالی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری میں یہی چاروں مثنویاں شوق کی تصنیف بتائی ہیں۔

نول کشور پریس نے مذکورہ انھیں چاروں مثنویوں کے دو مجموعے باتصویر ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۱ء میں شائع کیے۔ راقم کے پیش نظر ۱۸۶۹ء کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ یہ ۹۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ سب سے پہلے بہارِ عشق ہے پھر زہرِ عشق ہے، پھر لذتِ عشق ہے۔ اور آخر میں فریبِ عشق ہے۔ سب سے آخری صفحہ پر منشی محمود علی صاحب متخلص بہ افسر کی چند سطروں کی تقریظ درج ہے موصوف لکھتے ہیں:۔

"اب مطلب کا بیان ہے۔ عشق مجازی کی داستان ہے۔ بہارِ عشق، لذتِ عشق فریبِ عشق، زہرِ عشق کا مطالعہ کیجیے۔ اس رباعی کے پردے میں نیرنگ جمالِ حقیقی کا مشاہدہ کیجیے۔ واقع میں یہ محبت کا مجموعہ ہے۔ حسن و عشق کا خاتمہ ہے۔ حکیم نواب مرزا صاحب شوق لکھنوی نے تصنیف کیا ہے۔ عاشق مزاجوں کے اہتمام سے مطبع نول کشور واقع لکھنؤ میں چھپا ہے۔"[1]

چوں کہ یہ نسخہ شوق کی زندگی میں طبع ہوا تھا اس لیے اکثر و بیشتر اہل قلم حضرات نے مندرجہ بالا عبارت کو مستند قرار دے کر یہ یقین کر لیا کہ شوق مذکورہ چار مثنویوں کے مصنف ہیں۔ دراصل یہیں سے شوق کی مثنویوں کی تعداد کے سلسلے میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور اکثر صاحبِ قلم حضرات شوق کی چار مثنویوں کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ جب امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں، حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں، علامہ کیفی نے خم خانۂ جاوید میں، سرراس مسعود نے انتخابِ زریں میں، خواجہ احمد فاروقی نے ذوق و جستجو میں اور فراق گورکھپوری نے اردو کی عشقیہ شاعری میں شوق کی چار مثنویاں ۱۔ زہرِ عشق۔ ۲۔ فریبِ عشق۔ ۳۔ بہارِ عشق۔ ۴۔ لذتِ عشق ظاہر کی ہیں۔ مجنوں گورکھپوری

---

[1] مثنویاتِ شوق۔ نول کشور ۱۸۶۹ء ص ۹۴۔

نے بھی دیباچۂ زہر عشق میں متعلق اپنے مضمون (مطبوعہ نگار۔ فروری ۱۹۲۸ء) میں چار ہی مثنویوں کا ذکر کیا ہے مگر لذتِ عشق کو وہ شوقؔ کی تصنیف نہیں مانتے۔ بلکہ اس کی جگہ ایک دوسری مثنوی (در تاریخ قیصر باغ) کا حوالہ دیتے ہیں، جو آج تک کبھی کسی کو دست یاب نہیں ہوئی۔ اس لیے اُس کا وجود ناقابلِ یقین ہے۔

عطاء اللہ پالوی نے لذتِ عشق کے سلسلے میں بارہ دلیلیں پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی شوقؔ کی تصنیف نہیں بلکہ آغا حسن نظمؔ کی مثنوی ہے۔

راقم کو پالوی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے اور راقم کے پیشِ نظر لذتِ عشق کا وہ نسخہ[1] بھی ہے جو مراد اللہ کی فرمائش پر خواجہ رحیم الدین کے اہتمام سے مطبع فیضی میں چھپا تھا۔ اس نسخے پر مصنف کا تخلص نظمؔ ظاہر کیا گیا ہے سرورق پر ذیل کی عبارت درج ہے۔

"شاعرِ تیز زباں طوطی ہندوستان آغا حسن متخلص بہ نظمؔ ہمشیر زادہ حکیم تصدق حسین خاں صاحب دام اقبالہٗ"

مندرجہ بالا عبارت سے صاف عیاں ہے کہ لذتِ عشق شوقؔ کی تصنیف نہیں بلکہ ان کے بھانجے نظمؔ لکھنوی کی تصنیف ہے جیساکہ مثنوی کے آخر میں نظمؔ نے اپنا تخلص بھی استعمال کیا ہے اور یہ نسخہ نواب مرزا کی زندگی میں ہی شائع ہوا تھا۔ مزید براں شوقؔ کا واسوخت جو کہ شعلۂ جوالہ جلد دوم میں شامل ہے اُس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

"(شوقؔ) یہ تخلص ہے حکیم تصدق حسین عرف نواب مرزا کا خلف آغا علیخاں ہیں۔ مولد و مسکن اُن کا لکھنؤ ہے۔ کلام میں نہایت صفائی ہے۔ طبیعت عاشقانہ پائی ہے، زبان شستہ و رفتہ، محاورات خوب، کلام دلچسپ ہے شاگرد استاد عدیم المثال یگانۂ روزگار آتش بیان خواجہ حیدر علی آتشؔ کے ہیں۔ مثنوی بہارِ عشق اور زہرِ عشق اور فریبِ عشق کے جو مشہور

---

[1] کتب خانہ مسعود حسن رضوی ادیب

فی الآفاق ہے اور یہ واسوخت جو شامل اس مجموعہ بے نظیر کے کیا گیا ہے ان سے یادگار ہے[1]۔"

فدا علی عیشؔ نے کبھی مندرجہ بالا عبارت میں شوقؔ کو صرف مثنویوں کا ہی مصنف ظاہر کیا ہے۔ چوتھی لذتِ عشق اگر ان کی تصنیف ہوتی تو اس کا ذکر بھی عیشؔ ضرور کرتے۔

بہر حال اب تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ لذت عشق شوق کی تصنیف نہیں بلکہ ان کے بھانجے آغا حسن نظمؔ کی تصنیف ہے اور اب اکثر و بیشتر محقق ادب اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ شوقؔ نے صرف تین ہی مثنویاں لکھی تھیں اور وہ ہیں بہارِ عشق، فریبِ عشق اور زہرِ عشق۔ بقیہ ان سے منسوب جتنی مثنویاں مشہور ہیں، سب فریب ہیں۔ اس سلسلے میں عطاء اللہ پالوی لکھتے ہیں:۔

"بہر کیف جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے سوزِ عشق، قہرِ عشق اور خنجرِ عشق ہو یا لذتِ عشق کوئی بھی شوقؔ لکھنوی کی تصنیف نہیں بلکہ دوسروں کا سرمایۂ خرافات ہیں جو غیر ذمہ دار لالچی اور خود غرض مطابع اور تاجرانِ کتب نے پیسے کمانے کے لیے شوقؔ کے سر تھوپ دیا ہے۔ اسی طرح قیصر باغ کی تعریف میں بھی شوقؔ نے کوئی مثنوی نہیں کہی ہے۔ احسن صاحب کی اطلاع محض خیال ہی خیال ہے دراصل شوقؔ نے صرف تین ہی مثنویاں لکھی ہیں۔ ۱۔ فریبِ عشق، ۲۔ بہارِ عشق۔ ۳۔ زہرِ عشق۔ اور یہ تینوں مثنویاں بحر خفیف مسدس مجنون مقطوع یا محذوف میں ہیں جس کا وزن ہے فاعلاتن۔ مفاعلن فعلن یہ تینوں مثنویاں متعدد بار شائع ہو چکی ہیں[2]۔"

۱۔ **فریبِ عشق** یہ شوقؔ کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔ شوقؔ نے ۱۸۴۶ء میں اسے مکمل کیا۔ اس مثنوی میں چار سو اٹھائیس اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا ایک قدیم نسخہ مطبوعہ ۱۲۷۲ھ (مطبع آغا جان مسمّٰی بہ فیضی) پروفیسر مسعود حسن صاحب

---

[1] شعلۂ جوالہ جلد دوم ص ۵۴۳۔ [2] تذکرہ شوق عطاء اللہ پالوی ص ۸۶۔

کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ تیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے دوسرا نسخہ نول کشور پریس کا مطبوعہ ہے جو ۱۸۶۹ء میں مثنویاتِ شوق کے مجموعے میں شامل ہو کر طبع ہوا تھا۔ راقم کے پیش نظر یہی آخرالذکر نسخہ ہے۔ راقم طوالت کے باعث زیادہ تفصیل میں نہ جا کر اس مثنوی کے بارے میں بعض مشہور اہل قلم حضرات کی رائے پر اکتفا کرے گا مصنف تذکرۂ شوق "فریب عشق" کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:-

"فریبِ عشق واقعاتی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے واقعاتی بایں طور کہ اس میں اس عہد کی" بیگماتِ اودھ" کی پوری قلعی کھول کر رکھ دی گئی ہے۔" معزز خواتینِ لکھنؤ کا کچا چٹھا پیش کر دیا گیا ہے صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ وہ چلمن کی آڑ میں کس طرح شکار کھیل رہی ہیں... ہماری عورتیں درگاہ اور کربلا میں مسجدوں اور مندروں میں بالعموم جایا کرتی ہیں چنانچہ شوقؔ کے زمانے میں بھی جایا کرتی تھیں۔ شوقؔ نے اپنے عہد کے ایسے اجتماع میں نقطۂ نظر کا بڑا فرق پایا تو اس مثنوی کے ذریعے علی الاعلان اہل لکھنؤ کو اس سے آگاہ کیا کہ اس وقت کربلا' درگاہ' اور وہ سارے مقامات مقدسہ جہاں جہاں مذہبی آڑ لے کر اجتماع مرد و زن ہوا کرتا ہے شبستانِ عیش اور آوارگی کا اڈا بنے ہوئے ہیں اور ہماری عورتیں وہاں ہرگز تزکیۂ نفس کے لیے نہیں بلکہ تسکینِ نفس کے لیے جایا کرتی ہیں۔[1]"

"اس حیثیت سے کہ فریبِ عشق ہماری روزمرہ زندگی کا ایک تاریک پہلو بڑے رنگین الفاظ میں اجاگر کرتی ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ شوقؔ نے اس مثنوی میں عورت اور مرد کی فطرت اور نفسیات بڑی صفائی اور کامیابی اور ایمانداری کے ساتھ پیش کی ہے۔ میرے نزدیک یہ مثنوی سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے اور اس کے غائر مطالعے کے بعد شوقؔ کو بحیثیت فن کار

---

[1] تذکرۂ شوق ص ۳۰۳

اور آرٹسٹ، داد دینے کو الفاظ نہیں ملتے۔[1]

زبان کے اعتبار سے فریبِ عشق میں وہ روانی اور جوش نہیں جو کہ زہرِ عشق اور بہارِ عشق میں ہے اسی لیے تو مولانا عبدالماجد دریابادی کو شوق کی تصنیف تسلیم کرنے میں تکلف ہوا موصوف لکھتے ہیں :۔

"اور فریبِ عشق بہ مشکل ہی ان کی تسلیم کی جا سکتی ہے ممکن ہے نومشقی کے زمانے کی ابتدائی تصنیف ہو۔ یقین کے ساتھ جن دو مثنویوں کو ان کی تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے ان میں ایک کا نام بہارِ عشق ہے اور دوسری کا زہرِ عشق ہے۔"[2]

نمونے کے لیے اس مثنوی کے چند اقتباسات قارئین کی نظر ہیں۔ شوقؔ کے عہد کی خانگیوں کی زبان ملاحظہ ہو:۔

اے لو میں تو کہوں سبب کیا ہے	ارے تو ہی نواب مرزا ہے
اک ہی مرشد ہو تم قصور معاف	سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف
بے وفائی میں، دل جلانے میں	تو تو مشہور ہے زمانے میں
جعل سازی یہ تجھ کو کیوں کر آئی	ایک کو سائی دوسرے کو بدھائی
دور بھی ہو نگوڑے سودائی	موا ہر دیگی چمچہ ہرجائی
کس کے عاشق بنے ہو کیسی چاہ	میں کہاں تم کہاں معاذ اللہ
ایک ذرا ہٹ کے بیٹھو منہ نہ بنواؤ	کہے چونی کبھی مجھ کو گھی سے کھاؤ
ساتھ لے دے کے اپنے یاروں کو	مینڈھ کی بھی چلی مداروں کو
مردوا ہو وے نوج اس گت کا	جیسے دھونسا نگوڑا نوبت کا

مہربانی ادھر کو کم رکھیے	میرے اوپر ذرا کرم رکھیے

---

[1] تذکرۂ شوق ص ۳۱۳۔ [2] اردو کا ایک بدنام شاعر۔ مجنوں ایڈیشن زہرِ عشق ص ۵۶۔

وہ ہے یہ بھی خیال میں تیرے — میں نہ آؤں گی جال میں تیرے
آگ میں کوئی آپ جلتا ہے — جیتی مکھی کوئی نگلتا ہے
آپ سے کوئی جی گنواتا ہے — جان کر زہر کوئی کھاتا ہے
کوئی دے مل کے تجھ سے اپنی جان — تو تو بتیس دانت میں ہے زبان
ایک ہی خانماں خراب ہے تو — چیونٹیوں کا بھرا کباب ہے تو

پوری مثنوی میں رکاکت اور ابتذال کا نام نہیں ہے۔ بیگماتی زبان اور محاورں کو نہایت ہی صحت اور صفائی سے پیش کیا گیا ہے انداز بیان آسان اور سادہ ہے اگرچہ اس مثنوی کو زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ مگر راقم کی رائے میں یہ زہر عشق یا بہارِ عشق سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ زبان و محاورات کی جو پاکیزگی اور خوبی اس مثنوی میں ملتی ہے۔ شاید زہر عشق یا بہارِ عشق میں نہیں بحیثیتِ مجموعی شوقؔ کی یہ مثنوی بلند پایے کی ہے۔

۲۔ بہارِ عشق شوقؔ کی دوسری مثنوی بہارِ عشق ہے۔ یہ ۱۸۶۷ء میں منظر عام پر آئی۔ اس مثنوی میں آٹھ سو بیالیس اشعار ہیں اس کے بہت سے ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں جن میں مندرجہ ذیل نسخے مستند قرار دیے جا سکتے ہیں۔

(۱) بہارِ عشق۔ مطبوعہ سلطان المطابع ۱۲۶۶ء ص ۴۲

(۲) بہارِ عشق با تصویر۔ مطبوعہ مطبع محمدی کانپور ۱۲۶۸ھ ص ۴۲۔

(۳) بہارِ عشق با تصویر مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۹ء

(۴) بہارِ عشق مطبوعہ مطبع علوی علی بخش خاں ۱۲۷۷ھ

(۵) بہارِ عشق با تصویر مطبوعہ مطبع نامی شجرالہند ص ۱۶۔ ۱۲۸۸ھ

ان کے علاوہ بھی بہت سے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں جن کی تفصیل طوالت کے باعث نہیں دی جا سکتی۔

شوقؔ کی یہ مثنوی بھی عہدِ امجدی کی تہذیب و معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس دور کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو شوقؔ نے اپنی اس

مثنوی میں پیش کیا ہے۔ شوقؔ نے ان فطری رموز کا ذکر کھلم کھلا کیا ہے، جن کا ذکر اشارے میں ہونا چاہیے۔ کھلے لفظوں میں نہیں۔ شاید اسی لیے یہ مثنوی دیگر مثنویوں سے زیادہ بدنام ہوئی۔ اس سلسلے میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:۔

جتنی یہ داستان عریاں اور غیر مہذب ہے اتنی ہی اس کی زبان شستہ ورفتہ، سادہ اور بے تکلف ہے۔ روانی اور صفائی کا یہ عالم ہے جیسے شفاف پانی کا چشمہ پہاڑ کے دامن سے ابل رہا ہو۔ جو بندش ہے وہ چست جو محاورہ ہے وہ درست جو لفظ ہے وہ برمحل ہے[1]"

دوسری جگہ فاروقی صاحب فرماتے ہیں:۔

"بہارِ عشق پر خردش جنسی رجحانات کی لذت فزا کہانی ہے جو صرف زبان کے اعتبار سے اہم ہے اس میں نہ قصے کی دل آویزی ہے نہ کردار کی بلندی نہ کوئی تدریجی ارتقا۔ کردار کے حرکات و اعمال اور قصے کے واقعات میں توازن کم رکھا ہے اور مثنوی کا ارتقاء ایک سیدھی لکیر سے دکھلایا گیا ہے[2]"

"بہارِ عشق پلاٹ یا کردارنگاری کے اعتبار سے کوئی بلند پایہ مثنوی نہیں ہے۔ اس کی عظمت کا راز زبان کے لطف اور محاورے کی چاشنی میں پوشیدہ ہے۔ اس زمانے میں جب کہ لفظی صنعت گری کو حسنِ معنی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ مرزا شوقؔ نے سادگی و سلاست کے دریا بہا دیے اور عشق و عاشقی اور حسن و جوانی کے راگ کو ایسی میٹھی بول چال میں چھیڑا کہ دہلی کے شیوا بیان اور شیریں زبان بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس رسوائے عام مثنوی کے کتنے ہی اشعار ایسے ہیں جو آج بھی زبان زدِ خلائق ہیں[3]"

---

[1] ذوق و جستجو۔ [2] و [3] ذوق و جستجو ص ۲۱۸ - ۲۱۴۔

مؤلف تذکرہ شوق فرماتے ہیں:۔

"میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو زبان میں اس رنگ کی یہ واحد مثنوی ہے اور اس خصوصیت میں زہرِ عشق بھی مقابلہ نہیں کر سکتی جو زبانِ اردو کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول ترین مثنوی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہارِ عشق نہ صرف زبان و بیان کی شگفتگی کے لحاظ سے بلکہ اور حیثیت سے بھی اردو زبان کی عجیب و غریب مثنوی ہے۔"[1]

پروفیسر مجنوںؔ گورکھپوری کا خیال ہے:۔

"جہاں تک زبان کی سلاست، الفاظ کی ترتیب اور محاورات کے رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے بہارِ عشق کو شوقؔ کی ہر مثنوی پر فوقیت حاصل ہے۔"[2]

راقم کی رائے میں بہارِ عشق اگر زہرِ عشق سے بہتر نہیں ہے، تو کمتر بھی نہیں ہے۔ اگر زہرِ عشق شوقؔ کا شاہکار ہے، تو بہارِ عشق بھی کسی شاہکار سے کم نہیں۔ شوقؔ کے کمالِ فن کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ پوری مثنوی بغور پڑھ لی جائے یہاں طوالت کے باعث راقم چند اقتباسات پر اکتفا کرتا ہے مرقع نگاری کی شان دیکھیے مثنوی کی ہیروئن کی شان ہی نرالی ہے:۔

حسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند
چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند

جلوۂ حسن، رشکِ شعلۂ طور
چشمِ بد دور، آنکھیں موتی چور

رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال
رگِ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال

بے مسی کے وہ دانت رشکِ گہر
جانِ عاشق نثار ہو جس پر

قد میں آثار سب قیامت کے
گوری گردن میں طوق منت کے

رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم
جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم

---

[1] تذکرہ شوق ص ۳۴۸۔ [2] زہرِ عشق مجنوں ایڈیشن ۱۹۳۰ء ص ۱۴۔

عکسِ رخ موتیوں کے دانوں میں — بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے — پیاری پیاری کچیں نکالے ہوئے
رگِ گل سے کمر لچکتی ہوئی — چوٹی ایڑی تلک ٹیکتی ہوئی
پائنچے ناز سے جو اس نے اٹھائے — میں پکارا خدا کمر کو بچائے

روزمرّہ کی عام زبان ملاحظہ ہو:۔

ہنس کے اس نے کہا حواس میں آؤ — ان مری باتوں پہ تم نہ اتراؤ
ایسا آسان ان کا آنا ہے — سہل کچھ آپ کا بلانا ہے
کس نے یہ مشورہ بتایا ہے — دل کہیں اور بھی لگایا ہے

نسوانی زبان کے انداز پر نظر ڈالیے۔

نوج نوچندی کو میں جاتی آج — آئی ہوں کیسی ہولیں کھاتی آج
بھیڑ نے آج دم تمام کیا — ایسی درگاہ کو سلام کیا
ساتھ ماما نہ آج گر جاتی — کیسی بختاوری مری آتی

مصوّری کا ایک اور نمونہ دیکھیے۔

منہ دوپٹے سے ڈھانپتی اُتری — خوف کے مارے کانپتی اُتری
نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا — سر پہ آنچل اُلٹ کے ڈال لیا
سب حیا سے بدن چرائے ہوئے — پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے
چال اٹکھیلیوں سے چلتی آئی — دل کو پانو کے نیچے ملتی آئی
گھنگھرو جوتی کے جھنجھاتے ہوئے — ہاں میں ہاں اور یہ ملاتے ہوئے
پانی پانی جو دل تھا سینے میں — جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں
کچھ دکھائی تھی کچھ لگاوٹ تھی — کچھ حقیقت تھی کچھ بناوٹ تھی

۳۔ زہرِ عشق

زہرِ عشق نواب مرزا شوقؔ کی تیسری اور آخری مثنوی ہے۔ یہ مثنوی غالباً ۱۸۶۰ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان مکمل ہوئی۔ نظامی بدایونی نے زہرِ عشق کا سالِ تصنیف ۱۲۷۷ھ قرار دیا ہے[1]۔ اس مثنوی میں مجموعی

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طور پر پانچ سو چھیاسٹھ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کے بہت سے ایڈیشن اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ سب سے قدیم ایڈیشن کا حوالہ گارساں دتاسی کے اٹھارویں خطبے میں ۹ ۸ ر دسمبر ۱۸۶۲ء) ملتا ہے۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۲ء کا مطبوعہ بتایا ہے۔ غالباً سب سے پہلا ایڈیشن یہی ہوگا۔ مگر آج تک مذکورہ نسخے کا منظرِ عام پر آنا ثابت نہ ہوا۔ اس کے بعد مطبع نول کشور کا نسخہ ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔ پھر تو زہرِ عشق کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ پچاسوں ایڈیشن چھپ کر بازار میں آگئے اور مفاد پرستوں نے اس کی صحت کا بھی خیال نہیں رکھا۔ بلکہ بعض ناشروں نے اس میں بہت سے اشعار گھٹا بڑھا کر پیش کیے اور بعض نے تو پوری پوری نئی مثنوی شوقؔ سے منسوب کر کے چھپوا ڈالی جس کا شوقؔ سے دور کا واسطہ نہ تھا۔

اس مثنوی کی شہرت باذوق حضرات تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ اس دور کی تھیٹر کمپنیوں نے بھی اس کو ڈرامے کی شکل میں، بہت ہی مؤثر انداز میں جگہ جگہ پیش کیا۔ ایسا مشہور ہے کہ ایک بار لکھنؤ میں کسی تھیٹر کمپنی نے پیش کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک لڑکی نے اس عشقیہ داستان سے متاثر ہو کر خودکشی کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتِ ہند نے اس کو اسٹیج پر پیش کرنے کی ممانعت کر دی، اور اس کے مضامین کو عریاں قرار دے کر اس کی طباعت، اور اشاعت پر پابندی عائد کر دی۔ اور پھر اس کتاب کا چھپنا ممنوع قرار پاگیا لیکن طباعت بند ہونے کے باوجود، لوگ اپنے ہاتھ سے اس نسخے کو نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے اور پڑھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔

اس کے بعد پھر ۱۹۱۹ء میں بعض اربابِ علم و ادب کی کوششوں کے نتیجے میں، اس مثنوی پر سے پابندی اٹھالی گئی اور حکمِ امتناعی منسوخ ہو گیا۔ پابندی ختم ہوتے ہی سب سے پہلے نظامی بدایونی نے ستمبر ۱۹۱۹ء میں زہرِ عشق کا ایک عمدہ ایڈیشن، مطبع نظامی سے شائع کیا، اور دوبارہ ۱۹۳۰ء میں اسی کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

اس کے بعد پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے ۱۹۳۰ء میں زہرِ عشق کا ایک نیا ایڈیشن ایک طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور احسن لکھنوی

کا مضمون بھی شامل کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں جن کی تفصیل فضول ہے۔

شوقؔ کی اس مثنوی کو ان کی دیگر مثنویوں پر فوقیت حاصل ہے۔ جتنی شہرت زہرِ عشق کو حاصل ہوئی، کسی دوسری مثنوی کو نہیں حاصل ہو سکی۔ بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ اس مثنوی کے ہیرو خود نواب مرزا شوقؔ ہی ہیں۔ مولانا حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں، مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے مضمون "اردو کا ایک بدنام شاعر" میں، عطاء اللہ پالوی نے تذکرۂ شوق میں، اس بات کا اعتراف کیا ہے، کہ شوقؔ نے خود آپ بیتی بیان کی ہے۔ پالوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"بہر حال میرا خیال ہے کہ ان مثنویوں کے ہیرو خود شوقؔ تھے، اور انھوں نے جو کچھ پیش کیا، وہ اُن کے تجربات اور مشاہدات ہیں، اور یہ ہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ شوقؔ کے فنکار، اور آرٹسٹ ہونے کا۔"[1]

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اس مثنوی کی بلند پائگی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"مثنوی زہرِ عشق اردو شاعری میں زبان و بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور اپنے حیاتی رنگ کے اعتبار سے بڑی مکمل چیز ہے۔ اس میں لکھنؤ کے زوال پذیر ماحول کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے اور اس مرقعے

میں لکھنؤ کے زوال پذیر ماحول کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے اور اس مرقعے

میں جتنی تصویریں ہیں وہ صاف اور روشن ہیں لیکن اس کا ابتدائی حصہ سستا اور عامیانہ ہے۔"[2]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"مثنوی زہرِ عشق میں زبان، منظر کشی، جذبات نگاری اور نفسیاتی واقعات کا اعجاز نظر آتا ہے۔ بعض اخلاقی مضامین مثلاً دنیا کی ناپائداری اور بے ثباتی کے بھی نہایت اعلیٰ مرقعے ملتے ہیں۔ روزمرہ اتنی صفائی کے ساتھ دوسری

---

[1] تذکرۂ شوق ص ۱۱۶ ۔ [2] ذوق و جستجو ص ۱۹۴۔

جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔ اسی طرح عورتوں کی زبان بالکل انھیں کے انداز میں پیش کی گئی ہے اور مرزا نے اس کا بھی پورا حق ادا کر دیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ساری مثنوی پڑھنے اور لطف لینے کے لائق ہے[۱]۔"

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا بیان ہے:۔

"زہرِ عشق کو اردو ادب میں وہی مرتبہ دینا چاہیے جو جرمن فلسفی نگار گوئٹے کے "SORROW OF WERTHER" کو ملا ہے۔ سنا ہے کوئی صاحب اردو میں اس کا ترجمہ "آلام ورتھر" کے نام سے کر چکے ہیں[۲]...... واقعات اور ترتیبِ واقعات کے لحاظ سے زہرِ عشق اور "آلام ورتھر" میں کوئی مناسبت نہیں ہے...... لیکن اثر کے اعتبار سے دونوں ایک پایے کی چیزیں ہیں[۳]۔"

پروفیسر آل احمد سرور کی رائے ہیں:۔

"لکھنؤ کی بہترین مثنوی گلزارِ نسیم بتائی جاتی ہے۔ مگر میرے خیال میں شوق کی زہر عشق کو یہ درجہ دینا چاہیے۔ لکھنؤ کی ساری مثنویوں میں سب سے زیادہ روشن اور تھرتھراتی ہوئی تصویریں شوق کی مثنویوں میں ملتی ہیں[۴]۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو مثنویات میں زہرِ عشق کو کیا مقام حاصل ہے۔ اس مثنوی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور شوق کے کمالِ فن پر بحث کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے یہاں طوالت کے باعث یہ ممکن نہیں۔ مثنوی کے صرف چند اقتباسات نمونے کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شوق نے دخترِ سوداگر کے حسن و شباب کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

---

[۱] ذوق و جستجو ص ۱۹۲۔ [۲] اس کتاب کا ترجمہ "نوجوان ورتھر کی داستانِ غم" کے نام سے ڈاکٹر سید ریاض الحسن صاحب ایک عرصہ ہوا کر چکے ہیں، اور یہ کتاب تقسیم ملک سے پہلے شائع ہو چکی ہے۔ [۳] زہر عشق مجنوں ایڈیشن ص ۲۳۔ [۴] نگار لکھنؤ سالنامہ ۱۹۵۵ء لکھنؤ اور اردو ادب

سبزۂ نخلِ گلِ جوانی تھا — حُسنِ یوسف فقط کہانی تھا
اس سن و سال پر کمال خلیق — چال ڈھال انتہا کی نستعلیق
چشمِ بد دور وہ حسین آنکھیں — رشکِ چشمِ غزالِ چیں آنکھیں
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر — آنکھ بھر کر نہ دیکھتے تھے ادھر
تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر — خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر
تھا نہ اس شہر میں جواب اس کا — حسن لاکھوں میں انتخاب اس کا
شعر گوئی سے ذوق رہتا تھا — لکھنے پڑھنے کا شوق رہتا تھا
رُخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی — جو ادا اس کی تھی قیامت تھی
تھا یہ اس گل کا جامہ زیبِ تن — سادی پوشاک میں تھے سو جوبن

جذبات نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

کل کسے تم گلے لگاؤ گے — یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے
حال کس کا سنائے گی آ کر — کس کو ماما بلائے گی آ کر
ہم تو اٹھتے ہیں اس مکاں سے کل — اب تو جاتے ہیں اِس جہاں سے کل
یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں — پان کل کے لیے لگاتے جائیں

غرض کہ اس مثنوی کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل اور برمحل ہے پوری مثنوی پڑھنے سے ہی پورا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ چند نمونے اور ملاحظہ ہوں۔

پھر لپٹ کر مرے گلے اک بار — حال کرنے لگی وہ یوں اظہار
اقربا میرے ہو گئے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہوتے ہیں یہ آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں — جبر کیوں کر یہ اختیار کریں
گو ٹھکانے نہیں تجھے ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں تیرے پاس

بے حیا ایسی زندگی کو سلام — منہ پہ آئے نہ تجھے کبھی یہ کلام

طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے
موت بہتر ہے ایسے جینے سے
خونِ دِل کب تلک پیئے کوئی
بے حیا بن کے کیا جیے کوئی
نوعِ انسان بے حمیت ہو
آدمی کیا نہ جس کو غیرت ہو
بات کس طرح وہ بشر سے اٹھے
نہ سنا ہو کبھی جو کانوں سے
وہ سنے جس کو ایسی عادت ہے
اس میں کیا اپنی غیرت ہے

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرتِ حورِ مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
ایک فقط نام نام باقی ہے
کوئی لیتا بھی اب نہیں ہے نام
کون سی گور میں گیا بہرام
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو سرکش جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور

شیدا

نواب محمد حسن خاں نام اور شیدا تخلص تھا۔ نواب رمضان علی خاں بہادر (جو یمین الدولہ سعادت علی خاں بہادر کے برادرِ نسبتی تھے) کے بیٹے تھے۔ یہ فن

شاعری میں خواجہ آتش کے شاگرد تھے[1] آغا حجو شرف نے شیدا کا تعارف یوں کرایا ہے:

محمد حسن خاں شیدا جو ہیں ۔۔۔ امیروں میں شاعر ہو یدا جو ہیں
یہ نواب زادے ہیں دیں دار ہیں ۔۔۔ بڑے متقی اور ابرار ہیں
تو آتش کے شاگرد ظاہر ہیں یہ ۔۔۔ عمائد ہیں حاجی و زائر ہیں یہ
نہایت ہے پاکیزہ ان کا کلام ۔۔۔ سدا سے سخنوروں میں ہے نام
جناب آغا صاحب جو ہیں نام دار ۔۔۔ بڑے بھائی شیدا کے ہیں باوقار[2]

ان کی سوانح کے سلسلے میں کسی قسم کی اور نشان دہی نہ ہو سکی۔ نساخ کا بیان ہے کہ یہ صاحب دیوان تھے[3]۔ مگر راقم کو ان کا دیوان کہیں نہیں دستیاب ہوا۔ ستر[4] بندوں پر مشتمل شیدا کا ایک واسوخت ملا ہے اس کے علاوہ مختلف تذکروں سے چند متفرق اشعار بھی ہاتھ آئے ہیں۔

دستیاب شدہ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیدا صفائی زبان کا خاص خیال رکھتے تھے اور دلی جذبات انتہائی دل کشی کے ساتھ مؤثر انداز میں نظم کرتے تھے۔ فرسودہ مضامین کو بھی نیا لباس پہنا کر دل کش اور پر لطف بنا دیتے تھے حاصل شدہ کلام پیش خدمت ہے:-

دولتِ حسن ہر اک چاہتا ہے میں لوٹوں ۔۔۔ لوٹ میں ایسے ہیں یوسف کے خریدار ترے
سخنِ سخت نے ڈالے ہیں جگر میں سوراخ ۔۔۔ دل میں ناسور ترے ہاتھوں سے اے یار پڑے
باندھنا غیر کا مضموں ہے ننگ اے شیدا ۔۔۔ مالِ بیگانہ پہ آنکھ اپنی نہ زنہار پڑے

شرم آتی ہے غیر سے پردا نہیں کرتے ۔۔۔ باتیں یہ بُری کرتے ہو اچھا نہیں کرتے

---

[1] خوش معرکہ زیبا ص ۱۳۱م۔ [2] فسانہ لکھنؤ ص ۱۱۱۔ [3] سخن شعرا ص ۲۶۵
[4] مجموعہ واسوخت شعلہ جوالہ جلد دوم ص ۶۱۳۔

جب کہا آپ پہ مرتا ہوں تو ہنس کر بولے	منہ تو دیکھو یہ بڑے آئے ہیں مرنے والے

واسوخت

گوش زد یار ترے نام نہ تھا غیروں کا	لانے پاتا کوئی پیغام نہ تھا غیروں کا
خلوت و بزم میں کچھ کام نہ تھا غیروں کا	گرد حلقہ سحر و شام نہ تھا غیروں کا
دامنِ پاک سے گردِ نجس آگاہ نہ تھی
کوچہ گردوں کو طبیعت میں تری راہ نہ تھی

خود فروشی کے مقید تھے نہ خود کامی کے	پختہ کاری تھی چلن چھپنے نہ تھے خامی کے
ہونٹ سلواتے تھے دم سازوں سے پیغامی کے	ننگ آتا تھا تمھیں نام سے بدنامی کے
پری و حور سے بھی حسن پہ مغرور تھے تم
پاس تم کو نہ کسی کا تھا بہت دور تھے تم

کوئی آسکتا نہ تھا اپنے سوا صحبت میں	دوسرے کی نہ رسائی تھی تری خدمت میں
مختصر قصّہ ہمیں ہم تھے ہر اک حالت میں	انجمن میں ہمیں رہتے تھے ہمیں خلوت میں
مصحفِ رُخ کو سمجھتا تھا نہ ایماں کوئی
خالِ ہندو کا نہ عاشق تھا مسلماں کوئی

اٹھ گیا مہر و محبت کا زمانے سے رواج	بیٹھے بیٹھے اس الجھ پڑنے کا کیا کیجے علاج
یوں تو معشوقوں کا ہوتا ہے تلوّن کا مزاج	پر نہ اتنا بھی کہ کل تھی جو طبیعت نہیں آج
یا ہمیں ساتھ رہا کرتے تھے اندر باہر
یا ہمیں ہیں کہ ہمیں حکم ہے باہر باہر

جو خوشی خاطرِ نازک کی نہیں اس کا غم	کھائیے ترکِ محبت کی جو کھاتے ہو قسم
رہ نہیں سکنے کے بے شغل کہے رکھتے ہیں ہم	ڈھونڈ لیں گے کوئی زیبا صنمِ عیسیٰ دم
عشق بازی کے نہ بھولیں گے مزے یاد رہے
دل لگائیں گے فرنگی محل آباد رہے

ایسا شاہد ہے اب اللہ سے ہم کو مقصود   آشنائی جسے مقبول ہو رنجش مردود
سامنے اپنے تجھے کچھ نہ وہ سمجھے موجود   رخِ گل رنگ جو دکھلائے وہ بھیجے تو درود
نرگسِ چشم کا حیرت سے تماشائی ہو
سنبلیں زلف کی بو سونگھ کے سودائی ہو

خوں کرے دل کو تمھارے وہ رگِ جاں سی کمر   حلقۂ ناف کی تنگی سے رہو تنگ اکثر
ہاتھ ملتے پھرو پڑ جائے جو پانچو پہ نظر   چھلّا ہاتھ آئے تو گل کھایا کرو ہاتھوں پر
پانی پانی ہو ذقن دیکھو کے ایک حسرت ہو
کنویں میں ڈوب مرو کچھ بھی اگر غیرت ہو

مصرعِ قامتِ موزوں کا ہو آوازہ بلند   بیتِ ابرو ہو نہایت تری خاطر کو پسند
دل جلے خالِ سیہ رنگ سے مانندِ سپند   آنکھیں نظارۂ آئینۂ زانو میں ہوں بند
لعلِ لب دیکھے تو سر پٹکے بہت سنگ سے تو
ہونٹ چاٹا کرے نامِ دہنِ تنگ سے تو

خوبیِ گوش کرے اپنا تجھے حلقہ بگوش   پھر دل ہی رکھے وہ گردن کی صراحی مدہوش
دیکھ کر آئینہ ساں محو ہو حیرت سے خموش   حسن میں ہو نہ سکے اس سے غرض دوش بدوش
نقش دل پر ترے نقشِ درِ دنداں سے رہے
خار خار آٹھ پہر کاوشِ مژگاں سے رہے

مُقر اس کا ہو وہ الزام تجھے جو جو دے   عرقِ شرم سے رخسار و جبیں دھو دھو دے
خندہ زن ہو کے حقیقت کو تری کھو کھو دے   آگے اس گل کے تو شبنم کی طرح رو رو دے
طعن و تشنیع وہ خورشید لقا تجھ کو کرے
صورتِ ماہِ نو انگشت نما تجھ کو کرے

گفتگو اتنے میں تھی یہ شکایت آمیز   یاریِ غیر سے تا اب بھی کرو تم پرہیز
نقضِ پیماں کی نئے سر سے لکھو دستاویز   متوجہ ہو ادھر گو نگہِ لطف آمیز
پھر پری ہو وہی تم پھر وہی دیوانے ہیں ہم

پھر وہی شمع ہو تم پھر وہی پروانے ہیں ہم

صباؔ

میر وزیر علی نام اور صباؔ تخلص تھا۔ میر بندہ علی کے بیٹے تھے۔ ان کے ماموں میر اشرف علی نے ان کو اپنا متبنّٰی قرار دیا تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی نشو ونما ہوئی۔ اس زمانے میں علوم قدیمہ کا زور شور تھا۔ عربی صرف و نحو اور منطق کے ساتھ ساتھ دیگر علومِ قدیمہ جیسے فنِ طب اور علمِ کلام کا درس لینا شریف زادوں کا شیوہ اور امیر زادوں کا لازمی شعار تھا۔ جو لوگ مدرسوں اور مکتبوں میں جا کر سبقاً سبقاً درس نہ لے سکتے تھے، وہ بھی علماء اور بزرگوں کی صحبتوں میں اتنا کچھ حاصل کر لیتے تھے کہ اہلِ علم کی محفلوں میں شرمندہ نہ ہو سکیں۔ میر وزیر علی صباؔ نے ایسے ہی ماحول میں آنکھیں کھولیں، اور ایک اچھے شریف زادے کی طرح فارسی کی اعلیٰ اور عربی کی بقدرِ ضرورت تعلیم حاصل کی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو ہر طرف شعر و سخن کی محفلیں آراستہ تھیں۔ چوں کہ قدرتاً شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ اس لیے شعر گوئی کی طرف رجوع ہوئے۔ اس وقت لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں ناسخؔ اور آتشؔ جیسے اساتذہ کا طوطی بول رہا تھا۔ صباؔ نے آتشؔ کا رنگِ تغزل پسند کیا اور انھیں کے شاگرد ہو گئے۔ چوں کہ انھیں شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی۔ اس پہ آتشؔ جیسے استاد کی نگاہِ توجہ کا اثر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد فنِ شعر گوئی میں مشاق ہو گئے۔ آتشؔ کے شاگردوں میں خوب نام پیدا کیا اور بعد کو خود بھی استاد ہوئے۔ آتشؔ کے تلامذہ میں جتنے شاگرد صباؔ کو ملے، اتنے کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ صباؔ کے شاگردوں میں میر غلام عباس شرقؔ، عباس میرزا شمیمؔ، میر حبیب اللہ تارکؔ، منشی عبدالصمد حضورؔ، محمد میرزا خاں محمودؔ، محمد عبدالجلیل وجدؔ، محمد فصیح اللہ خاں وفاؔ، عبدالکریم رضاؔ، میر بادشاہ علی بقاؔ، خلف صباؔ، فروغؔ، ذوقؔ، سہاؔ وغیرہم میں سے اکثر صاحب دیوان اور استاد مانے جاتے تھے۔

آغا محمد شرفؔ نے اپنی تصنیف افسانۂ لکھنؤ میں صباؔ کا تعارف اس طرح کرایا ہے:-

جو سیّد وزیر علی تھے صبا — فرشتہ وہ تھے ان کو بخشے خدا
جہاں آشنا، باوفا، خوش چلن — خوش اوقات و خوش باش، خوش پیرہن
ہوئے بارہ سو پر اکھتر جو سال — گرے گھوڑے پر سے کیا انتقال
وہ آتش کے شاگرد تھے بے مثال — زباں آور و شاعرِ خوش جمال
نہ کیوں کر کہیں ہم انھیں لاجواب — کہ اُن کا تو ہر شعر ہے انتخاب
یہ حیدر حسین ان کے جو ہیں پسر — سمجھتا ہوں میں ان کو جان و جگر
یہ اقبال و شوکت ہویدا کریں — جہاں میں بڑا نام پیدا کریں
نمود ان کی شیریں کلامی سے ہو — کلام ان کا بڑھ چڑھ کے جامی سے ہو[1]

صبا کو اپنے استاد خواجہ آتش سے خاص عقیدت تھی۔ آتش بھی صبا کا بہت خیال کرتے تھے۔ صبا کو آتش کی شاگردی حاصل ہونے پر بہت فخر تھا جس کا اظہار انھوں نے جابجا اپنے کلام میں کیا ہے ؎

بیت ہستی کے صبا ہو گئے معنی روشن — خواجہ آتش سا زمانے میں جو استاد آیا

شہرہ ہے صبا اب تو اپنی بھی فصاحت کا — آتش کے مقلد ہیں سبحان کسے کہتے ہیں

آتش کے انتقال پر صبا کو دلی رنج ہوا جس کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

آنکھیں صبا پُر آب ہیں اس نور کے لیے — افسردہ دل ہیں آتشِ مغفور کے لیے

صبا مزاجاً بہت وضع دار، شریف طبیعت اور با اخلاق انسان تھے دائرۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اِس کے باوجود ان کی خاطر تواضع میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے تھے صبح سے شام تک دوست احباب اور ملنے والوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ حکیم میر رضا حسین سہا[2] کا بیان ہے کہ دوپہر سے رات تک دوست احباب کی خاطر تواضع میں دیگر تکلفات کے علاوہ تقریباً ایک سیر

---

[1] افسانۂ لکھنؤ ص ۲۴۱۔ [2] میر رضا حسین سہا میر وزیر علی صبا کے داماد تھے اور ۱۸۸۰ء تک لکھنؤ میں زندہ تھے۔ خم خانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۹۳۔

افیون خرچ ہو جاتی تھی۔ صبا سے جو شخص بھی ملنے جاتا اس کی تواضع دیگر تکلفات کے علاوہ افیون سے بھی ضرور ہوتی تھی کیوں کہ افیون سے خاطر تواضع کرنا شاید اس دور کی معاشرت کا ایک اہم جز تھا۔

صبا بہت ہی ہمدرد قسم کے انسان تھے ضرورت مند شرفا کی پوشیدہ طور پر کفالت اور ان کے ساتھ نیکی، اور محبت سے پیش آنا، ان کی خاص عادت تھی۔ اس سلسلے کا ایک خاص واقعہ صبا کے نام سے منسوب ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

میرزا محمد بڑی مونچھوں والے، احاطہ سنگی بیگ لکھنؤ کے رہنے والے، بڑے وضع دار اور بہادر شخص تھے۔ لیکن افلاس و پریشانی کا شکار رہتے تھے۔ اُن سے صبا سے خاص قربت تھی اگرچہ اپنی وضعداری کی وجہ سے صبا کا سلوک گوارا نہ کیا۔ ایک بار جب بہت پریشانیوں میں گھر گئے، اور فاقے تک نوبت پہنچی، تو ایک دن مرزا نے صبا سے مزاح کے طور پر کہا۔ کوئی ایسا عمل بتایئے جس سے ہماری پریشانی اور افلاس دور ہو۔ میر صبا نے کہا مجھے دستِ غیب کا ایک ایسا مجرب عمل معلوم ہے جو کبھی خطا ہی نہیں کرتا۔ وہ یہ کہ چالیس روز تک عشاء کی نماز کے بعد سات مرتبہ قل ہو اللہ پڑھتے رہیے۔ چالیسویں روز ایک شخص دروازے پر آکر دستک دے گا، نہ تم اس کو دیکھنا، نہ اس کو اپنی صورت دکھانا، البتہ اپنے دونوں ہاتھ باہر نکال دینا وہ شخص جو کچھ دے اسے لے لینا، اور فوراً دروازہ بند کر دینا۔ چنانچہ خود بہ نفسِ نفیس پنجشنبے کو تشریف لے جاتے، اور دستک دے کر دے آتے تھے۔ صبا کے انتقال کے بعد فاتحہ چہلم کے روز میرزا موصوف نے اپنا یہ قصہ بیان کیا، اور ساتھ ہی افسوس ظاہر کیا، کہ شاید صبا کے مرنے سے اس عمل کا اثر جاتا رہا۔

صبا لکھنؤ کے متوسط الحال لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ آخری تاجدارِ اودھ سلطانِ عالم واجد علی شاہ کی سرکار سے دو سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ مزید تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدولہ بہادر نبیرۂ نواب غازی الدین حیدر بہادر کی سرکار سے مقرر تھا۔ علاوہ بریں کئی باغ اور کچھ پرامیسری نوٹ ان کی ملکیت میں تھے جن کا منافع مسٹر جوزف کی معرفت وصول ہوا کرتا تھا[1]

(حاشیہ[1] اگلے صفحہ پر)

صباؔ نے ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ کو گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔[1] احباب اور شاگردوں نے خوب خوب تاریخیں کہیں۔ شیخ امداد علی بحرؔ لکھنوی نے یہ تاریخ کہی ہے:[2]

مادّۂ تاریخِ وفات

بحرؔ ایں مصرعِ جاں سوزِ گِسال و بعد "چمن ہستیٔ موہوم صباؔ شد برباد"

۱۲۷۱ھ

صباؔ کی وفات پر ایک قطعہ حضرت فوقؔ نے بھی کہا تھا۔ جس سے صباؔ کے انتقال کے بارے میں قدرے تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ قطعہ مذکور ذیل میں درج ہے:

قطعۂ تاریخِ وفات

جب گرے گھوڑے سے وزیر علی — کان سے منہ سے خون بہنے لگا
حکما سے کہا یہ جا کر حال — بولے وہ فصد لو تو ہو گی شفا
فصد کھلوائی جس گھڑی اُن کی — کیا کہوں کیسا ہو گیا نقشا
نبضیں ہاتھوں کی ہوگئیں ساقط — عالمِ نزع ہو گیا پیدا
غیر حالت جب اس طرح کی ہوئی — پنج شنبہ کی شب کا تھا پچھلا
بست و ہفتم مہِ صیام کی تھی — ہائے اس دن یہ سانحہ گزرا
روح نے کی مفارقت اس دم — خوب محشر بپا سبھوں نے کیا
گردشِ آسماں کے ہاتھوں سے — ایک زمانہ ہوا تہ و بالا
آفتابِ سخن ہوا پنہاں — ہائے اندھیر ہو گیا کیسا
فکرِ تاریخ اب کرو اے فوقؔ — جو کہ قسمت میں ہونا تھا وہ ہوا

پھر کہی یہ وفات کی تاریخ
گئے باغِ جہاں سے آہ صباؔ[3]

۱۲۷۱ھ

---

(1) بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰ کا) خم خانہ جاوید جلد پنجم ص ۲۵۳۔ (2) حاشیہ بر صفحہ ہذا۔ مثنویات دبستانِ لکھنؤ ص ۲۲۔ (3) غنچۂ آرزو ص ۱۹۵۔

شیخ ممتاز حسین جون پوری کا بیان ہے کہ صبا کی قبر محلہ شاہ گنج لکھنؤ میں ہے[۱]" واللہ اعلم

صبا نے ایک مثنوی صیدیہ اور ایک کلیات موسوم بہ غنچۂ آرزو اپنی یادگار چھوڑا۔ غنچۂ آرزو تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۳ سن ہجری نکلتا ہے۔ کلیات پہلی بار مطبع کان پور لکھنؤ میں طبع ہو کے شائع ہوا تھا۔ اس کلیات کے صفحات کی تعداد ۲۰۲ ہے۔

صبا کی مثنوی صیدیہ غالباً پہلی دفعہ ایک مجموعہ نغمۂ دلفریب میں' مطبع کارنامہ لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ تاریخوں سے اتنا پتا چلا ہے کہ اس مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۲۶۴ھ[۲] ہے۔ حالانکہ خود مذکورہ مثنوی پر اس کا سنِ طباعت درج نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ صحیح ہو۔ عبدالقادر سروری مرحوم[۳] اور رام بابو سکسینہ[۴] نے مذکورہ مثنوی کو نواب واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے شکار سے منسوب کیا ہے' اور اس کا نام "شکارنامہ واجد علی شاہ" بتایا ہے جو درست نہیں۔ یہ مثنوی نواب محسن الدولہ نبیرۂ غازی الدین حیدر بہادر شاہ اودھ اور نواب احمد علی خاں وزیر الممالک کے شکار سے متعلق ہے' جس میں نواب واجد علی شاہ بہادر شریک نہیں تھے۔ بلکہ موصوف نے صاحبانِ مذکور سے زندہ شیر لانے کی فرمائش کی تھی۔ جو آخر وقت شیر کی گرفتاری سے پوری ہوئی' مذکورہ مثنوی عام مثنویوں کے انداز پر حمد و نعت اور مدحِ سلطان سے شروع ہوتی ہے' اور پھر اصل واقعہ کا آغاز ہوتا ہے۔ سروری صاحب لکھتے ہیں" صبا نے میر و سودا کے شکارناموں کے طرز پر ایک مثنوی "شکارنامہ واجد علی شاہ" لکھی۔ لیکن اس میں نہ تو سودا کے شکارناموں کا شکوہ ہے' اور نہ میر کے شکارناموں جیسے مناظر اور مرقعے۔ یہ مثنوی ان کے کلام میں صرف اصناف کے تنوع کی خاطر رہ گئی ہے[۵]"

میر وزیر علی صبا کی شاعری ان کے زمانے کی لکھنوی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ لطفِ زبان اور اندازِ بیان لاجواب ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں صبا نے سلاست اور روانی کے دریا بہائے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

---

[۱] اردو مثنوی کا ارتقا ص ۱۳۱۔ [۲] تاریخ ادب اردو۔ [۳] تاریخ ادب اردو

[۴] اردو مثنوی کا ارتقا ص ۱۲۱۔

دل لگانا عذاب ہوتا ہے
آدمی کیا خراب ہوتا ہے
ہونی ہوتی ہے جب کہ بربادی
عشقِ خانہ خراب ہوتا ہے
مے پرستوں کے دن جو پھرتے ہیں
روز دورِ شراب ہوتا ہے

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے
توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو
کھول دے پر طائرِ ادراک کے
خاکساروں سے نہ کر پہلو تہی
ایک دن جانا ہے نیچے خاک کے

صبؔا مضمون آفرینی میں پیچیدگی سے گریز کرتے ہیں اور وارداتِ عشق کو بہت مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

مضمون پیچ دار ہیں مگر وہ اے صبؔا
اشعار ہر زمین میں ہیں عاشقانہ فرض

ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبؔا کو زبان پر پوری پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے یہاں محاورات کا استعمال بہت ہی منتخب اور برمحل ہے ؎

روبرو اُن کے صبؔا کی جو غزل گاتا ہے
چٹکیوں میں وہ مغنّی کو اڑا دیتے ہیں

چمن کوچۂ جاناں سے جو نکلے باہر
اے صبؔا خاک اڑاؤ گے بیابانوں میں

خدا کو انتہا لینی تھی اے دل جورِ گردوں کی
دگرنہ کب عدم سے ہم سا آفت کوش آتا ہے

الفتِ گیسوئے جاناں نے بڑا پیچ دیا
دام میں آ گئے ہم آپ کے دانا ہو کر

اے صبؔا ہم بھی وہ آندھی ہیں بقولِ ناسخؔ
اڑ کے جائے گا کہاں تختِ سلیماں ہم سے

صبؔا رعایتِ لفظی سے پرہیز کرتے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں

کیا ہے:-

اے صبا آپ رعایت نہ کریں لفظوں کی　　زرِ گل پایا جو گل چیں نے تو کیا مال ہوا

لیکن جہاں کہیں رعایتِ لفظی ہے وہاں تصنع اور مہملیت بھی صاف ظاہر ہے۔ ملاحظہ ہو:

قتلِ فرقت میں میں رندِ لاابالی ہو گیا　　منہ سرِ وہی کا لبِ جامِ سفالی ہو گیا

ہو گیا میں قتل ان کا نام لے کر پیار سے　　مجھ کو سیفی یار کا اسمِ جمالی ہو گیا

ہجر میں کیفیتِ گلزار مجھ کو سم ہوئی　　جام ہر لالے کا افیوں کی پیالی ہو گیا

معتقد ہوں اے صباؔ میں اُس ولی اللہ کا　　شیر جس کے معجزے سے شیرِ قالی ہو گیا

صباؔ کے یہاں بہت سی غزلوں میں تو سلاست اور روانی اس درجہ ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ صباؔ کا خاص رنگ یہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

بیٹھے جو وہ شب نقاب اٹھا کر　　بجھنے لگی شمع جھلملا کر

گر محبت کا دل میں داغ نہیں　　خانۂ کعبہ میں چراغ نہیں

سر پہ احسان لیں امیروں کا　　ہم فقیروں کا یہ دماغ نہیں

بعض ناقدین کی رائے ہے کہ صباؔ کے کلام میں لکھنویت بہت زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے یہاں بامزہ اشعار کی کمی ہے۔ بعض نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ صباؔ کے کلام کا رنگ آتشؔ کے مقابلے میں ناسخؔ سے قریب تر ہے۔ راقم کی رائے میں ایسا کہنا درست نہیں ہے۔ اگرچہ صباؔ کے یہاں اکثر اشعار ایسے ہیں جن میں عشق کی گرمی، اور محبت کا سوز بالکل مفقود ہے، آورد کی زیادتی، اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے، اور انھوں نے اکثر اشعار اپنے زمانے کی فضا سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود صباؔ کے بہت سے اشعار ان عیبوں سے پاک ہیں۔ انھوں نے بیشتر اشعار اپنے استاد کے رنگ میں کہے ہیں۔ وہی خیال کی دلفریبی، وہی بیان کی رنگینی، وہی ندرتِ خیال، وہی سلاست، وہی قلبی واردات، اور وہی مضمون کی بلندی۔ پھر یہ کہنا کہ صباؔ کا رنگ ناسخؔ کے رنگ سے قریب تر ہے، یا یہ کہنا کہ صباؔ کو درجۂ دوم کے شاعروں میں شمار کرنا چاہیے۔

اُس عظیم فن کار کے ساتھ کھلی ہوئی ناانصافی ہوگی۔

صباؔ پر تنقید کرنے والوں میں مولوی عصمت اللہ شاگردِ ناسخؔ کا نام سرِفہرست ہے انھوں نے اپنی تصنیف طومارِ اغلاط میں صباؔ پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں۔ جن میں اعتراضات لفظوں کی ترکیب پر، کچھ فصیح اور غیر فصیح محاورات پر، اور کچھ متروک، اور غیر متروک الفاظ پر ہیں۔ یقیناً کچھ اعتراضات قابلِ قبول ہیں، اور کچھ اعتراض برائے اعتراض کی حد میں آتے ہیں۔ مولوی آغا علی مدرّس مدرسہ ریاست محمود آباد نے ۱۸۸۵ء میں ان اعتراضوں کے جوابات، دلیل کے ساتھ رسالہ موسوم بہ تردید الاعتراضات میں دیے تھے۔ اُس کے بعد جناب عبدالباری آسیؔ نے اپنے تذکرے معرکۂ سخن میں ان اعتراضات کے جوابات یکجا کرکے اس پر اپنا قول فیصل صادر فرمایا ہے۔ طوالت کے باعث مذکورہ بحث کی تفصیل سے گریز کیا جا رہا ہے

بہر حال مندرجۂ ذیل اشعار سے قارئین خود صباؔ کی استادی اور قادر الکلامی کا اندازہ لگا سکتے ہیں:

کیسا کیسا نہ کیا بادِ خزاں نے برباد — زرِ گل کا نہ ہوا باغ میں توڑا کیا کیا
حال رونے کا جو لکھتا ہوں تو وہ کہتے ہیں — چشمِ پُر آب پہ طوفان ہے جوڑا کیا کیا

دھوئے گا اپنے تلوے وہ بت جو سنگِ پا سے — شیریں کا بیستوں پر نقشا خراب ہوگا
زلفوں کا عشق ان سے کیوں کر بیاں کروں گا — حالِ دلِ پریشاں گونگے کا خواب ہوگا

اے صباؔ پاؤں نہ اٹھتے تھے چمن سے اپنے — دستِ وحشت نے ہمیں جانبِ صحرا کھینچا

اے صباؔ گوشۂ زنداں میں مکدّر میں رہا — خاک اڑاتا طرفِ دامنِ صحرا نہ گیا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

جب مجھے اپنی حقیقت کھل گئی   جز سے کُل قطرے سے دریا ہو گیا

خوب رویوں سے دل صفا نہ ہوا   آئینہ صورت آشنا نہ ہوا

بلبل کہاں، بہار کہاں، باغباں کہاں   وہ دن گزر گئے وہ زمانہ گزر گیا

روزِ ازل کھلا جو کتب خانۂ بہار   سوسن نے دس ورق کا رسالا اٹھا لیا

عشقِ کامل نے دیا ہے حسن کا رتبہ ہمیں   آئینے میں دیکھتے ہیں یار کی تصویر ہم

خامشی کی تجھے کچھ قدر نہیں او غافل   دیکھ تو پوجتے ہیں بُت کو برہمن کیسا

فکر کونین کی رہتی نہیں مے خواروں میں   غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یاروں میں

شرابِ سرخ کے ساغر ہوں اور زاہد ہوں   وہ لال اور نشیلی جو انکھڑیاں دیکھیں

قیامت ہے کسی کو پیار کرنا اِس زمانے میں   قضا کا سامنا رکھا ہوا ہے دِل لگانے میں

صورت کا آشنا نہ ہو معنی کی دید کر   اے خود پسند دیکھ نہ بن بن کے آئینہ

گرمیوں میں جو پریشاں ہوئے ہم بادہ پرست   مانگی سر کھول کے ساقی نے دعا ساون کی

ہزار بار قیامت گزر گئی ہم پر   مگر ہنوز شبِ انتظار باقی ہے

جہادِ نفس سے ہے اے صبا تمھیں درپیش
بڑا ہی معرکۂ کارزار باقی ہے

خدا کا قہر بتوں کا عتاب رہتا ہے
اِس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

ہائے کیا بھول گئے یارِ عدم میں جاکر
کیا تماشا ہے کسی نے نہ کیا یاد مجھے

خاکساری نے اٹھانے نہ دیا سر ہم کو
خاک میں مل گئے ہم نقشِ کفِ پا ہو کر
باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا کبھی میلا ہو کر

خیالِ خام ہے امید رکھنا فیضِ دشمن سے
نہیں دیکھی کسی کی پیاس بجھتی آبِ آہن سے

فصلِ جنوں ہے جامہ دری کی بہار ہے
ٹوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں سے دور ہے

میں ہاتھ جوڑتا ہوں ترے آگے ناصحا!
پیچھے پڑا ہے کیوں دلِ خانہ خراب کے
بازار سرد ہے مہ کنعان کا ان دنوں
سکے پڑے ہوئے ہیں مرے آفتاب کے

چمنِ کوچۂ جاناں سے جو نکلے باہر
اے صبا خاک اڑا ئے گئے بیابانوں میں

شیخ صاحب کبھی عقبیٰ کا بھی دھیان آتا ہے
کچھ وہاں کے لیے بھی کشف و کرامات رہے

صباؔ تم ایک ہی آتشؔ زباں ہو چپ بھی رہو
چراغ پا کہیں سن کر نہ انوریؔ ہو جائے

منہ نہ لگیے دخترِ رز کے اپنے منہ پر جائیے
راز کھل جائے گا شیشے کا نہ منہ کھلوائیے

صبوؔر

کنور گوپال سہائے نام اور صبوؔر تخلّص تھا۔ یہ راجہ جیالال گلشن کے لڑکے اور بھوانی بخش کے پوتے تھے۔ ۱۸۲۱ء میں کایستھ سری واستوا خاندان میں پیدا ہوئے[1]۔ فن شعر و شاعری میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[2]۔ فارسی کے بہت اچھے نثار تھے۔ عہد شاہی میں فوج میں بخشی کے عہدے پر فائز رہے، اور جب انگریزوں کی عملداری ہوئی تو یہ ملیح آباد میں تحصیل دار کے عہدے پر مامور کیے گئے، اور پھر ایک سال بعد ریاست گوپال پور کے نائب مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ان کا کوئی دیوان بھی دست یاب نہ ہوا، صرف چند شعر تذکرۂ بہارِ سخن میں درج ہیں جو قارئین کی نذر ہیں:

جب نہ اثباتِ دہن ٹھہرا تو یہ ثابت ہوا
بات جو ہے یار کی وہ غیر کی آواز ہے

مالِ دنیائے دنی کی میں نہیں رکھتا ہوس
بندیاں روزِ ازل سے بابِ حرص و آز ہے

رازِ مطلق کو بھی عشرت میں نہ بھولے آدمی
بند ہے گر ایک در تو دوسرا در باز ہے

صدؔر

میر صدر الدین نام اور صدؔر تخلّص تھا۔ میر بدر الدین کے لڑکے اور خواجہ باسط

---

[1] تذکرہ بہارِ سخن۔ شیام سندر لال برق ص ۲۴۵۔ [2] تذکرۂ ہندو شعرا ص ۱۳۷۔

کے نواسے تھے۔ لکھنؤ کے قدیم باشندے تھے۔ فن شعر و شاعری میں حضرتِ آتش سے اصلاح لیتے تھے[۱]۔ چند غزلیں خوش معرکۂ زیبا میں ملتی ہیں اور کچھ متفرق اشعار دیگر تذکروں میں مل جاتے ہیں، جو پیشِ خدمت ہیں۔ صدر کا دیوان کہیں دست یاب نہیں ہوا۔

ایک مہمان گیا دوسرا مہمان آیا　　رونا جاتا رہا اپنا تو بھر آئیں آنکھیں
اس زمانے کے مرقّعے میں وہ تصویر ہیں ہم　　دیکھنے والوں نے بھی ہم کو دکھائیں آنکھیں

طول سے اُس کے یقین اپنی مجھے مرگ کا ہے　　عمر ہے خضر کی کوتاہ شبِ ہجراں سے

تیرے بہارِ حسن کا عالم نہ پائے گی گل　　ہنس کر ہزار اپنی خجالت مٹائے گی گل

سلسلہ ہے یہی جمعیّتِ خاطر کا صبا　　نہ پریشان کہیں وہ زلفِ معنبر ہو جائے
ہے یقین سختیٔ ایام سے اپنی مجھ کو　　موم کو ہاتھ لگاؤں تو وہ پتھّر ہو جائے

کون سا خورشید رو ہے جلوہ فرما بام پر　　صبحِ صادق کا گماں ہوتا ہے مجھ کو شام پر

صفاؔ

آغا محمد احسن نام، عرفیت نادر میرزا اور تخلص صفاؔ تھا۔ شاہ میر خاں نیشاپوری کے فرزند تھے۔ فن شعر و سخن میں خواجہ آتش سے اصلاح لیتے تھے[۲]۔ شاعری کے علاوہ خوش نویسی کا بھی شوق تھا، اور اس فن میں بھی کافی مہارت تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ان کا وثیقہ انگریزی سرکار نے ضبط کر لیا۔ تو انھوں نے رامپور کا رخ کیا، اور کئی برس

---

[۱] خوش معرکۂ زیبا۔ [۲] تذکرہ انتخاب یادگار ص ۱۹۸۔

تک نواب صاحب رام پور کی سرپرستی میں رہے۔ آخر عمر میں رامپور سے لکھنؤ واپس چلے گئے۔

امیر مینائی کا بیان ہے کہ صفا نے تقریباً ساٹھ برس کی عمر پائی۔ اور ۱۲۸۷ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا[1]۔ اِس سے زیادہ ان کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔ صرف ایک شعر اور رباعی دست یاب ہوئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

محتسب جھوٹ ہے کس نے بھری شیشے میں
رہ گئی ہے کہیں آنسو کی تری شیشے میں

رُباعی

اب حسرتِ وصلِ یار بس کر بس کر
اے صدمۂ انتظار بس کر بس کر
اتنا نہ تڑپ کہ سینہ شق ہو جائے
بس اے دلِ بے قرار بس کر بس کر

صولتؔ

خواجہ محمد صولت نام اور صولتؔ تخلص تھا یہ مولوی عبدالغفور کے لڑکے اور لکھنؤ کے قدیم باشندے تھے۔ فنِ شعر و سخن میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے[2]۔ اِن کے بارے میں بس اتنا ہی معلوم ہو سکا۔ چند غزلیں خوش معرکہ زیبا میں ملی ہیں وہ نمونے کے طور پر ہدیۂ ناظرین ہیں:

صبر فرقت میں ہمیں کرتے ہیں اتنا ورنہ
جان فرہاد نے دی مار کے تیشا سر پر
وضع بانکی سے کیا قتل مجھے قاتل نے
ترچھا اوڑھا تھا جو ایک روز دوپٹا سر پر
نکہ کچھ خوب ہوئی ہم سے نہ اس میں صولتؔ
ہو گیا بار یہ محسن کا تقاضا سر پر

آبِ حیواں میں بجھی ہے تیغِ یار
مُردے زندہ ہوئیں گے شمشیر سے

---

[1] انتخاب یادگار ص ۱۹۸۔ [2] تذکرہ سراپا سخن ص ۲۲

اے جنوں صحرا کو لے چل ہو چکا — استخارہ دانۂ زنجیر سے
آیۂ رحمت ہے اس کافر کا تیر — ہے وہ نامسلم جو بھاگے تیر سے
اس کی صورت کے مقابل گر کروں — رنگ یوسف کا اڑے تصویر سے

ہوئی خاطرِ شاد ناشاد کیا کیا — فلک نے کیا مجھ کو برباد کیا کیا
کوئی بات تو نے نہ مانی ہماری — بجا لائے ہم تیرا ارشاد کیا کیا
تغافل شعاری سے اس تند خو کی — ہوئی مشتِ خاک اپنی برباد کیا کیا
طبیعت نے لوٹے مزے کیسے کیسے — ان آنکھوں نے دیکھے پری زاد کیا کیا

ظفرؔ

شیخ ظفر علی نام اور ظفرؔ تخلص تھا۔ والد کا نام شیخ کرامت علی تھا۔ فنِ شعر و شاعری میں پہلے میر مظفر علی اسیرؔ کے شاگرد ہوئے۔ مگر بعد میں حضرتِ آتشؔ سے اصلاح لینے لگے[1]۔ ان کے حالات کے سلسلے میں تذکرے خاموش ہیں، ان کے چند اشعار دستیاب ہو سکے ہیں، جو درجِ ذیل ہیں:

یا ہم تھے یار قیب ہوا یار آپ کا — پہلو نشیں ہے گل کی جگہ خار آپ کا
پروا نہیں جو گھر میں جدائی ہے آپ کی — بندہ تو اب نہیں ہے خریدار آپ کا
غیروں سے مل کے ہم سے بھی ملنے کا ہے پیام — خوش ہے مزاج اے بتِ عیار آپ کا
سجدہ کبھی ظفرؔ نہ کرے اس طرف کو اب — کعبہ ہے آستاں اگر اے یار آپ کا

صحرا میں کیسے کیسے بڑھاتے ہیں خار ہاتھ — جوشِ جنوں میں ایک ہے دامن ہزار ہاتھ

---

[1] تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ص ۴۶۴۔

فصلِ بہار آتے ہی جوشِ جنوں ہوا — دامان و جیب کرنے لگے تار تار ہاتھ
ہے معرکۂ سخن کا مرے ہاتھ اے ظفرؔ — نامہ ملا کہ آئی مرے ذوالفقار ہاتھ

ظہورؔ

منشی جگل کشور نام اور ظہورؔ تخلص تھا۔ منشی جے گوبند پرشاد کایستھ کے بیٹے اور راجہ جیالال گلشن کے داماد تھے۔ فنِ شعر و سخن میں پہلے میر دوست علی خلیلؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد ہو گئے[1]۔ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی نثر نگاری میں اچھا ملکہ رکھتے تھے[2]۔ نہایت بااخلاق اور خوش مزاج رئیس تھے۔ ان کا وطن لکھنؤ تھا اور اس کے ایک مشہور محلہ اصطبل چار باغ میں رہتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ چند اشعار تذکرۂ یادگارِ ضیغم اور تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں ملے ہیں وہی نذرِ ناظرین ہیں:

پا تو پر گر کے گلے سے دلِ بسمل ملتا — چلتے پھرتے جو کہیں راہ میں قاتل ملتا
آشنا مرتے رہے بحرِ الم میں کتنے — یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل ملتا
کششِ عشق اثر کچھ جو دکھاتی اپنا — قیس سے نجد میں خود ناقۂ محمل ملتا

ادھر دیکھتا ہوں ادھر دیکھتا ہوں — تجھے دل ہی میں جلوہ گر دیکھتا ہوں
رخِ یار سے دی جو تشبیہ اس کو — دماغِ قمر عرش پر دیکھتا ہوں
ظہورؔ اس سہی قد کی نازک کمر کو — رگِ گل سے باریک تر دیکھتا ہوں

دیتی ہے پیچ کیا، ہمیں تقدیر دیکھیے — کیوں کر پھنسائے زلفِ گرہ گیر دیکھیے

---

[1] تذکرہ آثار الشعراء ہنود دیبی پرشاد بشاش ص ۱۰۔ [2] تذکرہ بہارِ سخن ص ۲۶۷۔

گو اپنے سامنے ہو مرقع جہان کا | تیرے سوا نہ اور کی تصویر دیکھیے
سیکھی ہے چشمِ یار فسوں سازیاں بہت | کس کس کے دِل کو کرتی ہے تسخیر دیکھیے
مدِّ نظر ہے دیدۂ مشتاق کو یہی | جب دیکھیے تو یار کی تصویر دیکھیے
دِل ہٹ گیا ہو جس بتِ ظالم سے اے ظہور | ہرگز نہ اس کی چاند سی تصویر دیکھیے

عارف

سید جلال الدین نام اور عارف تخلص تھا۔ میر بدر الدین کے بیٹے اور خواجہ باسط کے نواسے تھے۔ اپنے کلام پر خواجہ آتش سے اصلاح لیتے تھے[۱] مولف سراپا سخن اور مولف دیوانِ غریب کا بیان ہے کہ عارف صاحبِ دیوان تھے۔ مگر راقم کو تلاش کے باوجود ان کا دیوان دست یاب نہیں ہوا۔ کچھ اشعار تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں اور کچھ تذکرۂ نادر میں درج ہے ہیں جو قارئین کی نذر ہیں: اشعار ذیل میں فرسودہ مضامین کے سوا کوئی جدّت نہیں ہے:

سرخ ایک پیمانہ باندھا اے جانِ جاں بالائے سر | خون ہو جائے گا لاکھوں کا رواں بالائے سر

پلا وہ جام اے ساقی کہ جو ہو رشکِ جامِ جم
تماشا دو جہاں کا دیکھ لوں میں ایک ساغر میں

نکل جاتا ہے منہ سے رزق گر ہووے نہ قسمت کا
برنگِ آسیا انساں رہے گر لاکھ چکّر میں

مری وحشت کا باعث ان حسینوں کی ہے آرائش
وہاں زلفیں سنورتی ہیں جنوں بڑھتا ہے یاں سر میں

---

[۱] دیوان غریب ص ۱۲۹۔

ادھر جنبش ہوئی اُس کو اُدھر لاکھوں ہوئے بسمل
قیامت کی برش دیکھی ترے ابرو کے خنجر میں

کہتے ہیں ابروئے قاتل کو مصوّر دیکھ کر
ہم سے اِس تلوار کا نقشہ نہ کھینچا جائے گا

داغِ دل چاک گریباں بخشا
عشق نے کیا سر و ساماں بخشا

نہیں ہے نقدِ جاں تک پاس اب کس بات کا کھٹکا
عدم کے رہ روؤں کو ڈر ہے چٹھی کا نہ پرمٹ کا
ہوا قائل جیبِ طفلِ خو کی آج میں ہٹ کا
نہ مجھ کو سونگھنے دی بوئے گیسو لاکھ سر پٹکا

دِل بیچنے کھڑے ہیں ترے گھر کی راہ پر
ارزاں ہے مول لو جو اسے اک نگاہ پر

روشنی ہے عاشقوں کے دم سے باغِ دہر میں
بلبلوں کو اے گلو سمجھو گلستاں میں چراغ

ضعف سے کرتے ہیں دستِ غیر سے رفتار ہم
پانو رکھتے ہیں زمیں پر صورتِ پرکار ہم

عالیؔ

خواجہ عبید اللہ نام ابو جی عرفیت اور عالیؔ تخلص تھا۔ خواجہ عبد الشکور شاکر کے لڑکے تھے۔ ان کا وطن کشمیر تھا۔ یہ خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اور یہیں ساری عمر گزار دی۔ فنِ شعر و سخن میں حضرت آتشؔ کے شاگرد تھے۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

نہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ کچھ متفرق اشعار تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا اور تذکرۂ سراپا سخن میں دست یاب ہوئے وہی پیشِ خدمت ہیں:

خواب میں آئے اگر فرشِ مشجّر زیرِ پا | میری قسمت سے بنے ہر برگِ خنجر زیرِ پا
صورتِ دامانِ گل دل ہو گیا بس چاک چاک | آ گیا ہے باغ میں بلبل کا جب پر زیرِ پا
نور سے تیرے کفِ پا کے عجب کیا ہے بنے | خاک کا ہر ذرّہ خورشیدِ منوّر زیرِ پا
نہ رہے پاسِ ادب کو سوں پھرا ہوں دور دور | تا نہ آئے سایۂ دیوارِ دلبر زیرِ پا
قدر نیکوں کی نہ ہو کم لاکھ وہ پامال ہوں | آبرو جاتی نہیں گو آئے گوہر زیرِ پا
منکسر کرتی ہے آخر صحبتِ اہلِ کمال | دوپہر کو سایہ آ جائے سمٹ کر زیرِ پا
تیرہ بختی سے مری وہ بن گیا سنگِ سیاہ | جب کبھی آیا ہے عاؔلی سنگِ مرمر زیرِ پا

ہاتھ باندھے ہر ایک دلبر ہے | اے حنا! تیرا کیا مقدّر ہے
بوسے لیں غیر گالیاں ہم کھائیں | اپنا اپنا صنم مقدّر ہے
سر کٹا کر ملی ہے قاتل تھاہ | تا گلو موجِ آبِ خنجر ہے

ہووے تسکینِ دلِ مشتاق یا رب کس طرح | ہم نے مانا روزِ محشر وعدۂ دیدار ہے

ازل سے قدر نیکوں کی ہے کم تر | زحل بالانشین مشتری ہے
پری میں کون ہے معرخاب کا پر | اتارا جس کو شیشے میں پری ہے

دیکھی تاثیرِ عشقِ یوسف کو | اے زلیخا ترا غلام کیا

منعمانِ بے خبر کو کیا خبر اس گنج کی | دولتِ آسائشِ ترکِ تمنّا اور ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۴) تذکرہ سخن شعرا ص ۳۲۱۔

عبّاسؔ

میرزا عباس بیگ نام اور عباسؔ تخلّص تھا میرزا ذکی المتخلص بہ ندیمؔ کی اولاد ہیں تھے۔ بانس بریلی وطن تھا۔ اردو ادب کے ساتھ انگریزی ادب سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انشانویسی میں بھی مہارت تھی۔ ابتدا میں ریاست رامپور سے وابستہ رہے بعد کو لکھنؤ آ گئے، فنِ شعر گوئی میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[1] کچھ دنوں کے بعد لکھنؤ کو بھی خیرباد کہا، اور باندرہ چلے گئے۔ وہاں نواب صاحب کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ ابھی چالیس سال کی عمر تھی کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں اِن پر جرم ثابت کر کے پھانسی دے دی گئی۔ مصنّف خمِ خانۂ جاوید کا بیان ہے کہ "بدقسمتی سے اُس وقت بریلی کا حاکم مشرقی لٹریچر اور اردو شاعری سے ناواقف تھا جس وقت اس نے یہ شعر سنا ؎

اختر جھپک گئے ترے خالوں کے سامنے
گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

تو اس کو بغاوت پہ محمول کر کے پھانسی کا حکم دے دیا۔ اگر اس کی جگہ کوئی ہندستانی ہوتا تو اختر اور خال کی چمک، سیاہی اور سپیدی کا فرق سمجھ لیتا اور اس سے یہ غلطی سرزد نہ ہوتی"[2]

مصنفِ انتخابِ یادگار کا بیان ہے کہ ایک مثنوی جس میں فسانہ عجائب کو لیلیٰ مجنوں کی بحر میں موزوں کیا ہے، اور ایک دیوان ان کی تصنیف سے ہے مگر راقم کو نہ دیوان ملا نہ مثنوی ہاتھ آئی۔ چند متفرق اشعار ملے ہیں جو درج ہیں:

جب بیعتِ گُل کا شجرہ گُل نے نکالا
گیسو سے نیا سلسلہ سنبل نے نکالا

اُس قامتِ موزوں نے کیا سرو کو سیدھا
بل طرّۂ شمشاد کا کاکل نے نکالا

بدلا ہوا ہے رنگ سیاہی گھٹا کی ہے
لا ساقیا شراب کہ رحمت خدا کی ہے

---

[1] تذکرۂ انتخاب یادگار ص ۲۱۸۔ [2] تذکرۂ خمِ خانۂ جاوید جلد پنجم ص ۵۶۱۔

پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کیے　　قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے
عباسؔ روزِ حشر یہ کہتا اٹھوں گا میں　　لوٹا مجھے بتوں نے دُہائی خدا کی ہے

گیسوؤں کو وصل کی شب منھ پہ تم آنے نہ دو　　شرط بدتا ہوں قیامت تک سحر ہوتی نہیں

عدمؔ

واحد علی خاں نام اور عدمؔ تخلص تھا۔ رستم خاں لکھنوی کے بیٹے تھے۔ ۱۲۷۳ھ میں ان کی عمر چھبیس برس کی تھی[1] اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب سے بھی بخوبی واقف تھے فن شعر گوئی میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے[2]۔ صاحب خوش معرکہ زیبا کا بیان ہے کہ عدمؔ میرؔ وزیر علی صباؔ کے شاگرد تھے۔ مگر راقم کی رائے میں تذکرہ طبقات الشعرا مطبوعہ ۱۸۴۸ء کے بیان کو تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے بیان پر ترجیح دی جانی چاہیے۔ عدمؔ اکثر لکھنؤ کے قرب وجوار کے علاقوں کا سفر کرتے رہتے تھے اور نواب محمد جعفر خاں کی سرکار میں داروغہ کے عہدے پر مامور تھے۔ اس سے زیادہ ان کے حالات نہیں معلوم ہو سکے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

حور کو دیکھیں نہ اُس غنچہ دہن کے بدلے　　سیب جنت کو نہ لیں سیبِ ذقن کے بدلے
مست ہوں بعدِ فنا غسل مئے ناب سے ہو　　ساقی انگور کے پتّے ہوں کفن کے بدلے
تو وہ ظالم ہے کہ سر کاٹ کے دے دوں تجھ کو　　گالیاں دے مرے مُردے کو کفن کے بدلے
اے عدمؔ پیر ہوئے لطفِ جوانی نہ رہا　　گھر میں اب بیٹھ رہو سیرِ چمن کے بدلے

ستمگر ہیں جفا جو ہیں بہت بیداد کرتے ہیں　　حسینوں نے وہ سیکھا ہے کہ جو جلاّد کرتے ہیں

آہ کھینچوں گا میں جس روز قیامت ہوگی　　کانپ جائے گی زمیں چرخ پہ آفت ہوگی

---

[1] تذکرۂ طبقات الشعرا، مولوی کریم الدین ص ۴۲۸۔ [2] ایضاً۔

عزیزؔ

راجہ یوسف علی خاں نام اور عزیزؔ تخلص تھا۔ والد کا نام غلام رضا خاں دہلوی اور ماموں کا نام سعید الدولہ علی محمد خاں تھا۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ نگمان کے والد ترکِ وطن کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ پرگنہ ٹرہا دار الخلافہ لکھنؤ کی رانی جب اپنی سرتابی کی وجہ سے مغضوب بادشاہ ہوئی تو عزیزؔ اپنے ماموں سعید الدولہ کی حمایت سے وہاں کے راجہ بنا دیے گئے۔

عزیزؔ بادشاہ کے وفادار تھے، اور جب شاہِ اودھ واجد علی شاہ معزول کر کے کلکتے بھیج دیے گئے تو یہ بھی بادشاہ کے ساتھ کلکتے چلے گئے۔ مصنّفِ خوش معرکۂ زیبا کا بیان ہے کہ عزیزؔ مولوی محمد بخش شہیدؔ کے شاگرد تھے[1]۔ تذکرۂ رشکِ چمن مسمّٰی بہ بزمِ سخن کے مؤلف کا بیان ہے کہ، "علیٰ اختلاف القولین تلمیذ محمد بخش شہیدؔ یا آتشؔ بود و راست[2]۔" صاحب سخن شعرا لکھتے ہیں" صاحبِ سراپا سخن نے مولوی شہیدؔ کا شاگرد لکھا ہے لیکن انھوں نے راقم سے آتشؔ کا شاگرد رہنا بیان کیا تھا۔ واللہ اعلم[3]۔" دیوانِ گلدستۂ شعرا جلد ۱۸۵۹ء میں عزیزؔ کی ایک غزل درج ہے، جس کے اوپر لکھا ہوا ہے" غزل نواب اعتماد الدولہ سید محمد یوسف علی خاں بہادر متخلص بہ عزیزؔ شاگردِ خواجہ آتشؔ[4]۔" اگرچہ مذکورہ تذکرہ نگاروں نے واضح طور پر عزیزؔ کو آتشؔ کا شاگرد نہیں لکھا۔ مگر راقم کی رائے میں دیوانِ گلدستۂ شعرا کے بیان کو دیگر بیانات پر ترجیح دینا چاہیے۔ صاحب سخن شعرا کے بیان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ مان لینا چاہیے کہ عزیزؔ نے خواجہ آتشؔ سے اصلاح لی، اور اُن کی شاگردی سے فیض اٹھاتے رہے ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں مولوی شہیدؔ سے اصلاح لی ہو۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

---

[1] خوش معرکۂ زیبا ص ۵۰۴۔ [2] رشکِ چمن مسمّٰی بہ بزمِ سخن ص ۸۵۔ [3] سخن شعرا ص ۳۲۶۔ [4] دیوان گلدستۂ شعرا مطبوعہ ۱۸۵۹ء ص ۱۱

یاد گیسو میں نہ تھی شب کو مفر کی صورت | سخت جانی نے دکھائی ہے سحر کی صورت
شکوہ اُس دیدۂ کم بیں سے نہیں کم مجھ کو | جو نہ تمیز کرے سنگ و گہر کی صورت
عندلیب آن کے بے ساختہ بس بیٹھ گئی | تھی جو کچھ زخمِ جگر میں گلِ تر کی صورت
زلفِ لیلیٰ سے دلِ قیس تو چھوٹا لیکن | جھلملاتا ہے پڑا شمعِ سحر کی صورت
سابقہ سنگِ درِ یار سے ہے مجھ کو عزیزؔ | نہ بندھی آج تلک بالشِ سر کی صورت

کیا لکھوں حال دیدۂ تر کا | جوش اشکوں میں ہے سمندر کا
زلف طولانیِ صنم جو کُھلے | ہو یقیں طولِ روزِ محشر کا
سنتے سنتے تمھارے سخت سخن | دل مرا ہو گیا ہے پتھر کا
اس قدر ہے عزیزؔ کو تو عزیز | رہا دربان سدا ترے در کا

دلِ صد چاک میں وہ مہ جبیں ہے | کہ چلمن میں کوئی پردہ نشیں ہے
عزیزؔ افسوس وہ اتنا تو کہتے | ترا دل کس لیے اندوہ گیں ہے

نازک ہے یار شوق ہوا ہے شراب کا | ہوئے کشی کے واسطے پیالہ حباب کا

کچھ بس نہ چل سکا دلِ وحشی کے ہاتھ سے | چاہا بہت کہ کوچۂ جاناں نہ چھوڑیے

کوئی مجھ سا بھی جگر سوز نہیں دنیا میں | میری آہوں سے ہوئی شمعِ شبستاں پیدا

مہر کو یار کا ٹوٹا ہوا ساغر سمجھا | مہ کو میں جامِ سفالی کے برابر سمجھا
عشقِ ابرو میں ترے حال یہ پہنچا میرا | کہ ہر اک شاخ کو میں باغ میں خنجر سمجھا

کون وہ انساں ہے شکلِ روح جس میں تو نہیں
کون سا وہ گل ہے جس میں تو برنگِ بو نہیں

عشق

آغا رضا نام اور عشقؔ تخلص تھا۔ میرزا میر علی لکھنوی کے بیٹے تھے۔ فن شعر و سخن میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے[1]۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ ایک غزل تذکرہ سراپا سخن میں اور چند متفرق اشعار تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں درج ہیں جو قارئین کی نذر ہیں۔

آنکھوں سے یوں لگاتا ہوں اُس گل بدن کے پانو
جس طرح گبر پوجتے ہیں برہمن کے پانو

تلووں سے آنکھیں ملے جو سونا ہو اس کے ساتھ
چاندی ہے ہاتھ آئیں جو اس سیم تن کے پانو

صحرا میں مجھ غریب کو یہ ڈھونڈتے پھرے
دم سم ہوئے ہیں سوچ کے اہل وطن کے پانو

دیوانہ ہوں وہ میں کہ جو ہو جائیں ہاتھ شل
دامن کو چاک کرنے لگیں ہاتھ بن کے پانو

میری وفا کی قدر انھیں ہو تو ہے یقین
دھو دھو کے وہ پیا کریں مجھ خستہ تن کے پانو

غمِ طولِ شبِ فرقت کا یہ حاصل ٹھہرا　　جان پر بن گئی جینا مجھے مشکل ٹھہرا

---

[1] سخن شعرا ص ۳۳۲

بے قراری میں وہ اے ضبط مزے پائے ہیں | جان دے دوں گا ابھی میں جو مرا دل ٹھہرا
گفتگو ناصحِ بے عقل سے نادانی تھی | بحث مہمل سی جو کی آپ میں جاہل ٹھہرا
بے قراری نہ گئی یوں تو کبھی جیتے جی | جسم سے جان جو نکلی تو مرا دل ٹھہرا
دل پہ قابو نہ رہا ترکِ ملاقات کے بعد | سہل ٹھہرایا تھا جس کو وہی مشکل ٹھہرا
بے گنہ قتل مجھے کرکے تو بدنام نہ ہو | پہلے تقصیر تو کوئی مرے قاتل ٹھہرا

تارِ نفس کو کرتی ہے عمرِ رواں پسند | ہے کشتیِ حیات کو یہ بادباں پسند
مضمون بلند کرتی ہے طبعِ رواں پسند | مجھ کو زمینِ شعر کا ہے آسماں پسند
دیوانے کیا مقیدِ صوم و صلوٰۃ ہوں | پابندِ شرع کو ہیں یہ زنجیریاں پسند
کہنے کو یوں تو دل بھی ہیں آنکھیں بھی ہیں مگر | بہتر ہے وہ مکاں وہ کرے جو مکاں پسند
اے عشق ہو تو ایسی ہو گرمی کلام میں | یاں ہے زبانِ آتشِ شیریں بیاں پسند

فقیرؔ

میر کمال الدین نام اور فقیرؔ تخلص تھا۔ میر صدرالدین کے بھائی تھے۔ فنِ شعر گوئی میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے[1] نمونۂ کلام یہ ہے:

کون کہتا ہے منہ دکھا ہم کو | اپنی آواز ہی سنا ہم کو
ان بتوں سے کریں محبت ترک | اتنی توفیق دے خدا ہم کو
جب سے ہیں حسن پہ فقیر ہوئے | تب سے کہتے ہیں بے نوا ہم کو

کیا بُری خو ہے اے فقیرؔ ان کی | کیا ستم خوش جمال کرتے ہیں

---

[1] خوش معرکہ زیبا۔

نامِ عاشق کی ضد سے بلبل کو　　　مول لے کر حلال کرتے ہیں

کس پری پیکر کا دیوانہ یہ چرخِ پیر ہے　　　ہالۂ مہ طوق ہے اور کہکشاں زنجیر ہے

فیضؔ

ظفر یاب الدولہ میر احسان علی خاں نام، فیضؔ تخلص تھا۔ سید محمد تقی خاں کے بیٹے اور میر زین الدین خاں چکلے دار کے پوتے تھے[۱]۔ فنِ شعر گوئی میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[۲]۔

صاحبِ سخنِ شعرا اور صاحب سراپا سخن کا بیان ہے کہ فیضؔ صاحبِ دیوان تھے مگر راقم کو ان کا دیوان دستیاب نہیں ہو سکا۔ مختلف تذکروں میں چند اشعار ملے ہیں وہی درج کر رہا ہوں:

شوقِ وصلِ بتِ کم سن یہ سمایا دل میں　　　نہ رہا صبر و تحمّل کا ٹھکانا دل میں
چشمِ جاناں کی جدائی سے ہوئی کثرتِ داغ　　　خوب پھولا چمنِ نرگسِ شہلا دل میں
وحشتِ طائرِ راحت کا سبب ہم پہ کھلا　　　رشتۂ غم سے کوئی باندھا ہے کھٹکا دل میں
ہے دلِ آزار سے راحت کی توقع بے جا　　　ہو سکا سوزنِ مژگاں سے نہ بخیا دل میں
بیٹھنے دے گی نہ گھر میں کششِ خار مجھے　　　سر میں سودا ہے تو ہے الفتِ صحرا دل میں
اب کہاں او فلکِ پیر وہ طاقت ہم میں　　　ولولہ جوشِ جوانی کا کبھی تھا دل میں
پادشاہوں کو حزیں رکھتی ہے آوازِ گدا　　　ہو کہیں درد مگر ہوتی ہے اپنا دل میں
مر گئے دیکھتے ہی چشمِ فسوں ساز کو ہم　　　راہ سے آنکھوں کی جادو ترا آیا دل میں

---

[۱] تذکرۂ سخن شعرا ص ۳۷۶۔ [۲] دیوانِ غریب ص ۳۵۰۔

قاسم

سیّد قاسم علی نام اور قاسم تخلص تھا۔ بزرگوں کا وطن پنجاب۔ مگر یہ خود ترکِ سکونت کرکے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے[1] آغا حجو شرف نے قاسم کا تعارف اِس طرح کرایا ہے:

جو قاسم ہیں شاعر سنو ان کا حال — سخنور، سخن داں ہیں یہ بے مثال
غزل گوئی میں نام پیدا کیا — کہ نایاب مضمون ہویدا کیا
مضامینِ ایماں کے خواہاں ہوئے — خدا کے کرم سے مسلماں ہوئے
یہ تقدیر نے سر فرازا انھیں — کیا پاک دامن نوازا انھیں[2]

فن شعر گوئی میں حضرتِ آتش کے شاگرد تھے[3] سالِ پیدائش اور سالِ وفات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ شروع جوانی میں انتقال کیا۔ شعر گوئی کے ساتھ ہی ساتھ موسیقی کا بھی بہت شوق تھا، اور اس فن میں مہارت حاصل تھی[4] انگریزوں کے عہد حکومت میں کچھ دنوں تک تحصیل داری کے عہدے پر فائز رہے۔ مندرجۂ ذیل کلام اُن سے یادگار ہے:

گلِ جنّت مجھے دکھلائی دیا بو ہو کر — سر پہ آئی مرے تیغِ اجل ابرو ہو کر
سیر دیکھو نہ پریشانیٔ حالِ عاشق — چھا رہی ہے سرِ معشوق پہ گیسو ہو کر
ڈھونڈتی قیس کو لیلیٰ کی ہیں آنکھیں اب تک — باغ میں نرگسِ تر دشت میں آہو ہو کر
رہ گئے فکر میں انجام کی اپنے قاسم — ہوئے سر جوہرِ آئینۂ زانو ہو کر

گردشِ تقدیر سے ہوں سخت حیراں اے فلک — رزقِ بے منّت کے قابل آسیا تھی میں نہ تھا

---

[1] تذکرہ نادر ص ۱۲۵۔ [2] افسانۂ لکھنؤ ص ۱۴۷۔ [3] سخن شعرا ص ۳۷۸
[4] طبقات الشعراء۔ کریم الدین ص ۳۸۰۔

بازپرسِ حشر کا بھی خوف ہے اے دل ضرور — کون مانے گا کہ تقدیرِ خدا کچھ بھی نہ تھا

ایک بوسے کے عوض دیں اس نے لاکھوں گالیاں — بیش تر لذت ملی تقصیر سے تقریر میں

زمیں کو کر دیا رشکِ فلک رفتار جاناں نے — فروغِ پنجۂ خورشید ہے ہر نقش میں پا کے

قدسی

سید محمد اکبر نام، شاہ محمد جان عرفیت اور قدسی تخلص تھا۔ شاہ علی جعفر کے بیٹے اور حضرتِ شاہ اجمل الٰہ آبادی کے نواسے تھے۔ فنِ شعر گوئی میں خواجہ آتش کے شاگرد ہوئے[۱] زیادہ تر دائرہ اجمل الٰہ آباد میں قیام رہتا تھا۔ سیر و تفریح کی غرض سے لکھنؤ آئے تھے اور یہیں حضرتِ آتش کی شاگردی قبول کر لی[۲] اس سے زیادہ حالات نہیں معلوم ہو سکے[۳] نمونہ کلام یہ ہے:

لگا یا میں نے جو شب زلفِ پرشکن میں ہاتھ — شمیمِ مشک لگی گلشنِ ختن میں ہاتھ
یہ شاخِ نور ہے یا شمع ہے تہِ فانوس — نہاں ہے یا مرے دلبر کے پیرہن میں ہاتھ
تمام عمر تو جامہ دری میں گزری ہے — قرار سے رہیں کیوں کر مرے کفن میں ہاتھ
تسلّیِ دلِ بلبل ہوئی ہے اے قدسی — ہوئے ہیں قطع جو صیاد کے چمن میں ہاتھ

یاد آتی ہیں کافر جو ملاقات کی راتیں — کٹتی کسی عنواں نہیں برسات کی راتیں

کیف

شیخ فضلِ احمد نام اور کیف تخلص تھا۔ شیخ اکبر علی کشمیری کے بیٹے تھے۔ فن شعر

(حاشیہ نمبر ۱ تا ۳ اگلے صفحہ پر)

گوئی میں خواجہ آتش کے شاگرد تھے[۱]۔ مولوی کریم الدین کا بیان ہے کہ ۱۸۴۷ء میں کیف کی عمر تقریباً پچیس ۲۵ برس تھی[۲]۔ آغا حجو شرف نے کیف کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

جو ہیں فضلِ احمد خجستہ خصال | تخلص تو ہے کیف اب سنیے حال
توکل سے قانع ہیں ابرار ہیں | یہ مردِ خدا نیک کردار ہیں
یہ شاگرد آتش کے ہیں انتخاب | مضامیں نئے بندشیں لاجواب
یہ ہیں خوش فکر اور ہیں نکتہ داں | عروضی ہیں ان کو ہے علمِ بیاں[۳]

حضرت امیر اللہ تسلیم فرماتے ہیں:۔

"فضل احمد کیف شاگردِ آتش مغفور کا عجب دم تھا۔ ہمیشہ ان کی خوش گوئی اور معاملہ بندی کا مُقر ایک عالم تھا۔ جب تک اس خاک دانِ کدورت نشاں میں زندہ و سلامت رہے، تنہائی دوست دشمنِ کثرت رہے۔ آزادگی کہ خاصۂ اہلِ کمال ہے دل کو نہایت مرغوب تھی۔ اس عالمِ اسباب میں سوائے بے تعلقی کے کوئی چیز نہ محبوب تھی نہ مطلوب تھی۔ بدولتِ بے نیازی اور استغناء کے اربابِ دول سے نہ ملتے۔ کبھی بے ضرورت اپنے گوشۂ خلوت سے نہ ہلتے۔ اکثر خاموش رہتے، کونین فراموش رہتے۔ صورت سے پایا جاتا تھا کہ دل میں کچھ اشغالِ معنوی کا بھی مزہ تھا۔ ڈیڑھ برس سے مولوی انعام اللہ نجم تخلص ڈپٹی کلکٹر غازی پور خلف الصدق مولوی ولی اللہ صاحب مرحوم کی دولت سرائے بہ مقام فرنگی محل اقامت رکھتے تھے مولوی صاحب ممدوح ہر حال میں شرطِ خدمت بجالاتے تھے، چشمِ عنایت رکھتے تھے۔ آخر کار ۶۳ برس کی عمر پا کر مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ ۱۴؍ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ شب جمعہ کو گیارہ بجے راہی عالمِ بقا

(بقیہ حاشیہ ۱ و ۲ صفحہ ۲۰۴ کا۔ ۱؎ تذکرہ سراپا سخن ص ۱۸۴۔ ۲؎ تذکرہ سخن شعرا۔ ص ۳۸۴۔

۱؎ آئینۂ ناظرین ص ۲۲۱۔ ۲؎ تذکرہ طبقات الشعرا ص ۴۲۸۔ ۳؎ افسانہ لکھنؤ ص ۳۴۱۔

ہوئے . . . . مولانا انوار کے باغ میں زیبِ آغوشِ خاک ہوئے[1]

حضرت تسلیم کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ کیفؔ حضرت آتشؔ کے شاگرد تھے۔ اگرچہ بعض تذکرہ نگاروں نے جیسے مصنفِ سخن شعرا، مصنفِ خوش معرکۂ زیبا وغیرہ نے کیفؔ کو صباؔ کا شاگرد قرار دیا ہے۔ مگر راقم حروف کی رائے میں یہ درست نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دوبار صباؔ سے بھی مشورہ لیا ہو، مگر مندرجہ بالا تسلیمؔ کا بیان، آغا حجو شرفؔ کا تعارف اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کیفؔ خواجہ آتشؔ ہی کے شاگرد تھے۔ نیز خواجہ حسام الدین حسامؔ شاگرد کیفؔ مرحوم کی تصنیف کردہ تاریخ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کیفؔ خواجہ آتشؔ ہی سے اصلاح لیتے تھے ؎

رخت چوں زیں خاکدان تیرہ بست — شمعِ قندیلِ ارم شد روحِ کیفؔ
بود چوں شاگردِ آتشؔ گو حسامؔ — "گرمیٔ بازار آتشؔ بود حیف"[2]

۱۲۹۲ھ

اس کے علاوہ بھی میر دلدار حسن فوقؔ، مولوی فصیح اللہ وفاؔ مرزا مجھو بیگ عاشقؔ، شیخ اشرف علی اشرفؔ منشی امیر اللہ تسلیمؔ وغیرہم نے کیفؔ کے انتقال کی تاریخیں کہیں۔ اشرفؔ کی کہی ہوئی تاریخ درجِ ذیل ہے ؎

آتشؔ کے یادگار تھے کیفِؔ سخن سرا — ان کو بھی اِس جہاں میں نہ چھوڑا قضا نے وائے
اشرفؔ زباں پہ مصرع تاریخ آ گیا — کیفِؔ شرابِ موت سے ہے بند آنکھ ہائے[3]

کیفؔ صاحبِ دیوان تھے۔ اُن کا دیوان ۱۲۹۲ھ میں مطبعِ مصطفائی سے آئینۂ ناظرین کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس دیوان میں ۱۹۸ غزلیں ہیں اور یہ دیوان ۲۲۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

کیفؔ کے یہاں مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت قابلِ تحسین ہے۔ یہ جذبات کو

---

[1] دیوان آئینۂ ناظرین تقریظ از امیر اللہ تسلیم ص ۲۲۱۔ [2] آئینۂ ناظرین ص ۲۲۳
[3] آئینۂ ناظرین ص ۲۲۲۔

موثر اور دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں منتخب محاورات کا برمحل استعمال ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ یہ لکھنؤ کے محاوروں کو اپنے مخصوص انداز میں اِس طرح کا استعمال کرتے ہیں۔ کہ شعر کا لطف بہت بڑھ جاتا ہے وہ خود ہی ایک مقطع میں کہتے ہیں سے

محاورے کا مزہ ہو جنھیں بہت اے کیفؔ　　مرا کلام سنیں وہ مری زباں دیکھیں

ایک جگہ کہتے ہیں۔

محاورے کا مزہ ہے ہر اک زبان میں کیفؔ　　وہ شعر کیا ہے کہ جس میں ہوا استعارہ فقط

مندرجہ ذیل اشعار میں محاوروں کی خوبی ملاحظہ ہو۔

مے سے لبالب آج جو شیشا اٹھا لیا　　ساقی نے اپنے زعم میں اللہ اٹھا لیا
ہم میں بھی اتنی طاقتِ صبر و قرار تھی　　تیرا مزاج اے گلِ رعنا اٹھا لیا
کن محنتوں سے ہم نے بنایا خدا کا گھر　　ہم نے الگ خلیل سے کعبہ اٹھا لیا
لٹنے لگے جو روزِ ازل ظرفِ مے کشی　　جم نے پیالہ کیفؔ نے مینا اٹھا لیا

شام سے منتظر اے کیفؔ یوں ہی بیٹھا ہوں　　ہو گئی صبح نہ اب تک وہ دل آزار پھرا

کب دختِ رز کے واسطے قصے بڑھے نہیں　　تھانے گئے نہیں کہ عدالت چڑھے نہیں

کرے جاؤ جو وہ گل عذار محفل میں　　کھنچ آئے باغ کی ساری بہار محفل میں

شوخ رنگت ہے مرے خون کی تو اُسکو کیا　　لال ہوتی کیوں ہے کیوں مجھ سے حنا ملتی ہے
تپِ الفت کی حرارت نہیں کس کو اے کیفؔ　　ایک ہی آگ میں سب خلقِ خدا جلتی ہے

اس قدر ہے شہر میں جوشِ بہار اب کے برس　　گونجتی گلیوں میں ہے صورتِ ہزار اب کے برس

مینہہ برستا ہے شرابیں پی رہے ہیں بادہ خوار
کس قدر ہے رحمتِ پروردگار اب کے برس
ہم وہ مے کش ہیں اگر ہوتا ہمارا دست رس
باندھ رکھتے سرو سے پائے بہار اب کے برس
ہجرِ ساقی میں اگر مانگیں دعا برسات کی
پھٹ پڑے ہم پر یہ سقفِ زرنگار اب کے برس
اختلاطِ بلبل و گل سے کھلا اے کیفؔ یہ
سست ہے کچھ آمدِ فصلِ بہار اب کے برس

غضب ہے اب بھی نہ ساقی اگر شراب چلے
برسنے آئے برستے ہوئے سحاب چلے
کسی نے جھونک دیا آتشِ جہنم میں
تری گلی سے جو ہم خانماں خراب چلے
الٰہی وہ بھی دن آئے کہ پھر گلستاں میں
ہوائے سرد چلے ساغرِ شراب چلے
حریف تاڑ گئے بزمِ کیفؔ کا جلسہ
کبابیوں کی دکانوں سے جب کباب چلے

جگمگاتا ہے لبِ جو باغ میں مے خواروں کا
آج فردوس میں میلا ہے گنہ گاروں کا

مفتوں کیا ہے یار کو حسنِ بیاں سے کیا
نکلا ہے آج کام ہمارا زباں سے کیا

پیٹ کی خاطر نہ دھونا آبرو سے ہاتھ کیفؔ
منہ کی کھلوائے نہ تجھ کو آب و ناں کی احتیاج

شعر ایسے کہے جاتے نہ کبھی گرما گرم۔
یہ زمیں کیفؔ نہ کرتی جو مرا دل پانی

کیفؔ صرف محاورے کے ہی بادشاہ نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی رنگین بیانی بھی ان کے کلام کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بادۂ گل گوں سے ہے اے یار گویا ایک رنگ
اپنے ہونٹوں سے ملا کر تو لبِ پیمانہ دیکھ
ہم فقیر مست ہیں اے محتسب ہم سے نہ پوچھ
ٹوٹ جائے گا ہمارا مفت میں پیمانہ دیکھ
زاہدا! دن کو جو تو غیرت سے آسکتا نہیں
رات کو شمعِ حرم لا کر مرا بت خانہ دیکھ

بیچیں گے وہیں جا کے ہم اس جنسِ گنہ کو   کہتے ہیں جسے حشر ہے بازار خدا کا
ارشاد ہے یہ پیرِ خرابات کا ہم سے   کہنا نہ ذرا بھید خبردار خدا کا
اے کیفؔ یہ سب روئے زمیں ایک ہی نقطہ   ہے چرخِ بریں خامۂ پرکار خدا کا

اے واعظو! کہتے ہو جسے دوزخِ جہنّم   ایک نقطۂ باطل ہے مری فردِ عمل کا

آنکھوں کو عنایت کر وہ نورِ بصارت کا   کثرت میں نظر آئے جلوہ تری وحدت کا
کیا راہِ مجازی سے کیفؔ آگے قدم رکھے   حق ہے کہ بہت مشکل کوچہ ہے محبّت کا

خاک بھی حرمت نہ تھی جب تک نہیں دل دادہ تھا
دِل نہ تھا گویا بغل میں کعبۂ افتادہ تھا
فصلِ گل میں کیا کہوں کیسا رواجِ بادہ تھا
توبہ کے توڑنے پر کون کون آمادہ تھا
گرمِ رفتاری سے میری کیوں نہ جلتا وہ صنم
جادۂ دشتِ جنوں زنّارِ آتش دادہ تھا
احتیاجِ خضر کس کو تھی طریقِ عشق میں
تارتار اُس زلف کا دشتِ جنوں کا جادہ تھا
عشقِ گیسو سے ہمیں عشقِ کمر پیدا ہوا   مارِ رہزن منزلِ ملکِ عدم کا جادہ تھا
تھے مرید اے کیفؔ اپنے کیسے کیسے بادہ خوار   دامنِ تر ہی ہمارے واسطے سجّادہ تھا۔

اللہ رے شوقِ دِل کو اس بت کی جستجو کا   کعبہ بھی دیکھ آئے تھا ایک مقام ہو کا
رنگینیِ سخن سے کہتے ہیں رشک اِس کو   جب ہم نے لعل اگلے حاسد نے خون تھوکا
ہم کس طرح سے ناصح اس کو عزیز سمجھیں   دامن سے کچھ ہمارے رشتہ نہیں رفو کا

(۱۴) دبستانِ آتش۔

دو نعمتیں دے یارب دونوں جہاں میں مجھ کو
دیدار کا ہوں بھوکا، پیاسا ہوں آبرو کا

خدا سے مانگتے ہم بھی تو تاجِ زر ملتا
بہت گراں نظر آیا یہ بارِ سمہ لینا
طریقِ عشق میں اتنا تو ہم کو آتا ہے
کسی کے دل میں کسی طرح راہ کر لینا
یہ دورِ کیفؔ کا ہے مے فروش کیا ڈر ہے
جو محتسب سے بھی ٹوٹے تو جام بھر لینا

خونِ دل، اشکِ رواں، لختِ جگر، حسرتِ دید
ایک اِس آنکھ کے پردے میں چھپائیں کیا کیا
ذکر کرتے ہیں یہ واعظ مری مے خواری کا
عیب اپنا ہو تو اے کیفؔ چھپائیں کیا کیا

کبھی وحشت میں گریبان نہ پھاڑا ہم نے
تنگ جب آئے بہت اُن کا دہن دیکھ لیا
بال بیکا نہ ہوا شیفتۂ گیسو کا
بھر کے زخموں میں بہت مشکِ ختن دیکھ لیا

مدِّ نظر جو ان کو ہم سے حجاب ہوگا
دامانِ ماہِ کنعاں صرفِ نقاب ہوگا
بدلی تو آئے مے کش شیشے لیے پھریں گے
ہر ذرّے کی بغل میں اک آفتاب ہوگا
فصلِ بہار آئی شیشے پکارتے ہیں
باہر جو میکدے سے نکلا خراب ہوگا
بے ہوش کل اٹھا کر لائے تھے کیفؔ کو ہم
پھر آج میکدے میں خانہ خراب ہوگا

گلشن[1]

راجہ جیا لال نام، گلشنؔ تخلص تھا۔ یہ رائے بھوانی بخش صاحب قوم کایستھ تعلق دار مرتضیٰ نگر ضلع اُناؤ کے بیٹے[2] تھے۔ ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے[3] ان کے بزرگ

---

[1] تذکرۂ ہندو شعراء ص ۱۰۴۔

برابر دربارِ شاہانِ اودھ اور شاہانِ دہلی میں عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ یہ خود بھی محمد علی شاہ بادشاہِ اودھ کے زمانہ میں سر دفترِ محکمۂ خاصِ سلطانی پر ممتاز رہے۔ شہر لکھنؤ کے مشہور رئیسوں میں تھے۔ اور علم وادب سے خاص لگاؤ تھا۔ فن شعر وسخن میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[1]۔ ۱۸۶۵ء میں انتقال کیا۔ پھاٹک راجہ جیا لال (متصل سرائے معالی خاں)، اور باغ راجہ جیا لال (متصل علی گنج) لکھنؤ میں آج تک آپ کی یادگار میں موجود ہے۔ دست یاب شدہ کلام سے آپ کی کہنہ مشقی اور خوش بیانی عیاں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کوچۂ زلف سے دل پابہ رسن آتا ہے — یا کوئی وحشیِ صحرائے ختن آتا ہے۔
جس کو دیکھا وہ عدم سے تنِ عریاں لے کر — شہرِ ہستی میں خریدارِ کفن آتا ہے
شعر گوئی کا مجھے کچھ نہیں دعویٰ گلشنؔ — نہ میں شاعر ہوں نہ اندازِ سخن آتا ہے

مجلس میں جس طرف تری ترچھی نگہ ہوئی — اک تیر تھا کہ توڑ کے دل پار ہو گیا

دل بچھڑتے ہی گھبرا کے لگی جان نکلنے — الفت کے مرض نے دیا ہم کو نہ سنبھلنے

یہ عالم کاہشِ غم سے ہے اپنی ناتوانی کا — کہ یاروں کو تعجب ہے ہماری سخت جانی کا
قدرعنا صنوبر، زلف سنبل، چہرہ لالہ ہے — بہارِ باغ ہے عالم ترے جوشِ جوانی کا
ضرر پہنچا سکے کب شمع کو اقبال کے دشمن — نہ ہووے آتشِ یاقوت کو اندیشہ پانی کا
دلِ شیدا کی حالت پوچھیے گلشنؔ تو کہتا ہے — گلہ کس منہ سے کیجیے یار کی نامہربانی کا

کوئی ہے مانندِ شمع گھلتا، کوئی ہے پروانہ وار جلتا
نہیں جو وہ روشنیِ محفل عجب ہے احوال انجمن کا

---

[1] تذکرۂ خوش معرکہ زیبا ص ۲۷۴۔

قدم دھرا ہے جو عاشقی میں تو نیستی کو سمجھ لے ہستی
عزیز کرتا جو جانِ شیریں تو نام ہوتا نہ کوہ کن کا

منشیِ قدرت کے مداحوں میں اے گلشنؔ تو ہے
یہ سمجھ لے چاک تیرا نامۂ عصیاں ہوا

سررشتہ دِل کو زلفِ گرہ گیر سے ہوا
دیوانے کو یہ سلسلہ زنجیر سے ہوا

الفت جو ہم کو تجھ سے اے مہرباں ہووے
دل لے کے تو ہمارا خواہانِ جان ہووے

ماہؔ

میرزا عنایت علی بیگ نام اور ماہؔ تخلّص تھا۔ میرزا فیض علی قزلباش کے بیٹے اور میرزا مراد علی خاں کے پوتے تھے[۱] میرزا حاتم علی مہر مرحوم جو ناسخؔ مرحوم کے شاگرد تھے، ان کے حقیقی بھائی تھے۔ راجہ بلوان سنگھ بہادر، ابن راجہ چیت سنگھ بہادر والیِ بنارس کے مصاحبین میں ماہؔ کو خاص مقام حاصل تھا۔[۲] آبائی سکونت لکھنؤ میں تھی۔ مگر خود منتقل ہو کر اکبر آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ فنِ شعر گوئی میں یہ حضرت آتشؔ کے شاگرد تھے۔[۳] آغا حجّو شرفؔ نے ماہؔ کا تعارف اس طرح کرایا ہے:-

جو مرزا عنایت علی ماہ ہیں
یہ آتشؔ کے شاگرد ذی جاہ ہیں

کہوں کیا میں خوش گوئی کا ان کی حال
حقیقت میں یہ بے فکر ہے بے مثال

ہر اک شعر ہے بامزہ با مذاق
بہت ان کے شعروں کا ہے اشتیاق

---

[۱] دیوان غریب ص ۹۴۴ [۲] خوش معرکۂ زیبا ص ۱۲۴ [۳] تذکرۂ رشک چمن مسمّی بہ بزم سخن [۴] افسانۂ لکھنؤ ص ۱۴۳

ماہ کا سالِ پیدائش اور سالِ وفات صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکا۔ مؤلف تذکرۂ یادگارِ ضیغم کا بیان ہے کہ مذکورہ تذکرے کی تالیف کے وقت ماہ کی عمر تقریباً پچپن برس تھی[1]

عنایت علی ماہ صاحب دیوان تھے ان کا ایک دیوان ریاضِ ماہ کے نام سے بہت پہلے قنّوج کے کسی مطبع سے شائع ہوا تھا۔ یہ دیوان ایک سو ساٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں دو سو تیئیس ۲۲۳ غزلیں، چند قطعات، ستائیس ۲۷ بندوں پر مشتمل ایک مسدّس اور دس بندوں پر مشتمل ایک منقبت در مدح امام حسینؑ ہے۔ ماہ کا ایک واسوخت داغِ جگر ماہ کے نام سے ۱۲۷۴ھ میں مطبع مصدر النّو اور آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ یہ واسوخت بیس ۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور ساٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔

ماہ کو تلامذۂ آتش میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بعد کو یہ خود بھی استاد ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں احمد شاہ ناطقؔ، شیخ محمد افضل تجلّیؔ، شیخ بلاقی ذرّہ اور شیخ غلام نبی عرف نبی بخش مفتوںؔ نے خوب نام کمایا[2]

بہم رسیدہ کلام کے انتخاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہؔ شعر میں معنوی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے مضامین بلند اور پر کیف ہیں۔ اکثر پامال مضامین کو نئے اسلوب سے بیان کیا ہے۔ زباں پر پورا پورا عبور تھا مختصر یہ کہ اشعار کی گرمی میں آتشؔ کا شعلہ موجود ہے:

آہ و فریاد کا چرچا ہی مٹا میرے بعد — گم ہوئی قافلوں سے صوتِ درا میرے بعد
گرم بازارِ شہادت نہ رہا میرے بعد — کوئے قاتل کی ہوئی سرد ہوا میرے بعد
بے گنہ قتل کسی کو نہ کرے گا قاتل — کند ہو جائے گی شمشیر جفا میرے بعد
جامہ زیبی ہے حسینانِ چمن کی مجھ تک — پھٹ کے اترے گی ہر اک گل کی قبا میرے بعد
دلِ پژمردہ نظر آتے ہیں غنچے تا نے — گل کھلا باغ میں کیا بادِ صبا میرے بعد

---

[1] یادگارِ ضیغم ص ۳۰۵۔ [2] تذکرہ شعر و سخن۔ نیاز علی پریشاں ص ۱۴۴۔

کیفیتِ دل اور ہے احوالِ جگر اور — ایک درد کی صورت ہے ادھر اور اُدھر اور
کیا حسرتِ پرواز میں اڑتی ہے میری روح — بے بال و پری نے مجھے بخشے ہیں یہ پر اور
بس دیر و حرم دو ہی مکاں اس کے ہیں مشہور — مل جائے یہاں یار تو کیوں ڈھونڈیے گھر اور
چھپتے ہیں چھپائے سے کہیں پیار کے تیور — صورت کو بنا دیتی ہے الفت کی نظر اور

ہم خوب لگاوٹ کی نظر دیکھ رہے ہیں — مشغول کدھر ہیں وہ کدھر دیکھ رہے ہیں
اڑتے ہوئے ہم دیکھ کے مرغانِ چمن کو — کیا حسرتِ پرواز میں پر دیکھ رہے ہیں

صبا نکہتِ گل سے تو پوچھ اک دن — یہ بو باس کس کی اڑائی ہوئی ہے
اجی میرزا ماہ داغِ جگر سے — مکدّر بہت میرزائی ہوئی ہے

سورج ہے ماند یار کے گالوں کے سامنے — کالی گھٹائیں گرد ہیں بالوں کے سامنے
پھر عندلیب آمدِ فصلِ بہار ہے — صیاد پھر کھڑے ہیں نہالوں کے سامنے
طولِ شبِ فراق کا قصّہ بیاں کروں — ان لمبے لمبے گیسوؤں والوں کے سامنے
نیرنگیِ فلک سے تعجّب نہیں ہے ماہ — گورے شکست پائیں جو کالوں کے سامنے

دل کو ہر دم لبِ جاں بخش کا ایسا ہے خیال — زیست کی فکر میں جیسے کوئی بیمار رہے

ہر ماہ اس تلاش میں غائب ہوا کیا — اب تک نہ پائی ماہ نے اُس کی کمر کمر

وہ ور دِ طلب ہوں کہ تری راہ میں میں نے — کانٹا نہ کبھی آبلۂ پا سے نکالا

ادنیٰ بھی کام آتے ہیں اعلیٰ کے ایک دن — اچھوں کے منہ سے لگتا ہے تنکا خلال کا

پیرہن سے پھوٹ نکلا یار کا جسمِ لطیف　　حسنِ شکل بوئے گل جامے سے باہر ہوگیا

بے برگی پر اپنی رو دیا میں　　پتّا جو گرا کسی شجر کا

خالِ عارض میں ابھی ہوگی ملاحت پیدا　　سانولا رنگ ترا اور سلونا ہوگا

ہر روز نیا وعدہ ہے ہر روز نیا عذر　　بن بن کے بگڑتا ہے مقدّر کئی دن سے

کاندھوں پہ یاں جنازۂ ملکِ عدم میں روح　　کوسوں بڑھا ہوا ہے پیادہ سوار سے

مائلؔ

صادق علی خاں نام اور مائلؔ تخلّص تھا۔ مؤلّفِ یادگارِ ضیغم کا کہنا ہے کہ حسن یار خاں افضل کے شاگرد تھے[1] اور نظمؔ طبا طبائی کا بیان ہے کہ آتشؔ کے پیرو تھے۔ نواب حیدر نواز جنگ علّامہ سید علی حیدر نظمؔ طبا طبائی کے چشم دید بیانات اس طرح ہیں:-

"بادشاہی مردہے کے نواسے خواجہ آتشؔ کے بڑے پیروؤں میں سے تھے۔ آتشؔ کے دیوان کو اس طرح دیکھا کرتے تھے۔ جیسے کوئی سبق لیتا ہے۔ اُس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک محاورے کو وحیِ آسمانی سمجھتے تھے کوئی مرید ہو تو ایسا ہو۔ بادشاہ کے پاس انھوں نے (مائلؔ نے) اپنی غزل اصلاح کے لیے بھیجی۔ بادشاہ نے ایک آدھ لفظ بنا دیا اور کئی

---

[1] تذکرۂ یادگارِ ضیغم ص ۳۰۲-

شعراان کی ستائش میں لکھ کر غزل کو واپس کر دیا۔ مائل نے مجھے بھی بادشاہ کی اصلاحی غزل دکھائی تھی۔ اُن کا مصرع تھا " جھگڑا چکائے بھی کہیں قاتل لگا کے ہاتھ" بادشاہ کی اصلاح یہ تھی " جھگڑا چکا چکے کہیں قاتل لگا کے ہاتھ" اُن کی مدح میں بادشاہ نے جو شعر لکھ دیے تھے اُن میں کا پہلا شعر مجھے یاد رہے ؎

اے شاعرِ نو سخن خدارا　　　انداز سخن نے تیرے مارا

میں نے سنا کہ بادشاہ نے مائل کے ایک مطلع کو بہت پسند کیا۔ کئی دفعہ پڑھوایا۔ مطلع یہ ہے ؎

تصوّر تھا جو رونے میں گلوئے یار مہ رو کا　　　صراحی دار موتی بن گیا ہر قطرہ آنسو کا

یہ تین شعر مائل کے اور مجھے یاد آ گئے ؎

طریقِ گریہ تجھے چشم تر نہیں آتا　　　کہ ساتھ اشک کے خونِ جگر نہیں آتا

خدا دکھائے نہ تاریکیِ شبِ فرقت　　　کہ آسمان و زمیں کچھ نظر نہیں آتا

نہ جانے کس کا یہ تیرِ نظر تھا آفت کا　　　کہ التیام پہ زخم جگر نہیں آتا

لکھنؤ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ مائل اُس میں شریک تھے۔ ایک شعران کا حیدرآباد تک پہنچا ؎

موسٰی کی آنکھ اور ہے میری نگاہ اور　　　وہ جلوہ گاہِ یار میں بے کار آئے ہیں

بادشاہ کے مرنے کے بعد (۱۸۸۷ء) ایک مائل تھے۔ جو لکھنؤ میں زندہ بچے ایک میں ہوں جو حیدرآباد چلا گیا۔ اور ابھی تک زندہ ہوں۔"[1]

مندرجۂ بالا بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مائل نے اپنے فن کو سنوارنے اور نکھارنے میں خواجہ آتش سے فیض اٹھایا ہے۔ ہوسکتا ہے بذاتِ خود آتش کے حضور میں حاضری کا موقع نہ ملا ہو۔ بلکہ ان کے کلام کو معیار بنا کر اپنے فن میں مہارت حاصل

---

[1] ماخوذ از مضمون" سلطان عالم واجد علی شاہ اختر"۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب کتاب:۔ نذرِ مقبول مطبوعہ ۱۹۷۰ء ناحی پریس لکھنؤ۔

کی ہو۔ مؤلّفِ یادگارِ ضیغم کا بیان ہے کہ مذکورہ تذکرے کی تصنیف کے وقت مائل کلکتّے میں تھے، اور باون برس کی عمر تھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

بادشاہِ حسن و خوبی وہ حسیں ہو جائیگا　　　کوکبِ اقبال حالِ عنبریں ہو جائے گا
بھیج کر پروانہ لیں گے شمع سے تاجِ زری　　　جب علاقہ عشق کا زیرِ نگیں ہو جائے گا

بہت بہتر! کہوں گا میں نہ اپنا مدّعا پہلے　　　بنا لو عارضِ پُر نور پر زلفِ دوتا پہلے
ہمیں کو لوٹ کر اے یار یہ غارت گری سیکھی　　　کہاں تھا دلبری کا تم کو ایسا حوصلہ پہلے
جو گل پر مجھ کو اے ساقی گمانِ جامِ مُل ہوتا　　　کہاں چلتی تھی مستانہ چمن میں یوں ہوا پہلے

مجیبؔ

غلام حیدر نام اور مجیبؔ تخلّص تھا۔ فن شاعری میں اپنے کو حضرتِ آتشؔ کا شاگرد بتاتے تھے۔[1] قطعی ان پڑھ تھے۔ بہت دنوں تک کلکتّے میں قیام کیا۔ اِس سے زیادہ ان کے حالات نہیں معلوم ہو سکے۔ چند شعر دستیاب ہو سکے۔ جو درجِ ذیل ہیں۔

آپ آزاد کس کو کرتے ہیں　　　بندہ پرور! میں کچھ غلام نہیں

گر بعدِ فنا ظلم ترے یاد کریں گے　　　ہم زیرِ زمیں بھی نالہ و فریاد کریں گے
مرغانِ چمن چھوٹ کے بھی فریاد کریں گے　　　جب جب بھی اسیریِ قفس یاد کریں گے
ہم باغ میں خوش قامتیِ یار کے آگے　　　سو راستیِ سرو پہ آزاد کریں گے

---

[1] تذکرۂ سخن شعراء ص ۴۱۵۔

مظفرؔ

شیخ مظفر علی نام اور مظفرؔ تخلص تھا۔ دیوان حاتم علی بلگرامی کے بیٹے تھے۔ فنِ شعر و شاعری میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[1] اور کچھ حال نہیں معلوم ہو سکا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

آرزوئے دشت پیمائی نہیں — عاشقِ کاکل ہوں سودائی نہیں
آنکھوں کے پردے میں پنہاں یار ہے — دیدۂ مردم میں بینائی نہیں
نالہ و آہ و فغاں ہمراہ ہیں — گوشۂ وحشت میں تنہائی نہیں
سینۂ سوزاں میں کیا دل جل گیا — لب تک آہِ آتشیں آئی نہیں
بعدِ مردن اے مظفرؔ قبر پہ — شمع تک اُس گل نے جلوائی نہیں

منتہیؔ

میرزا احمد مستیا بیگ نام اور منتہیؔ تخلص تھا میرزا عبدالقادر کے بیٹے اور لکھنؤ کے قدیم باشندے تھے۔ فن شعر و سخن میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے[2]۔ مؤلفِ جواہرِ سخن کیفی چڑیا کوٹی نے منتہیؔ کا نام مہتاب بیگ لکھا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے دیگر تذکروں اور خود اِن کے دیوان میں "مستیا بیگ" لکھا ہوا ہے[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو نام میں کسی طرح کی غلط فہمی ہوئی ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے قبل منتہیؔ کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ اِس دورانِ قیام کی کل تصنیف غدر میں تلف ہوگئی۔ تاراجیِ لکھنؤ کے بعد منتہیؔ شہر باندہ چلے گئے۔ نواب صاحب

---

[1] دیوانِ غریب ص ۳۵۳۔ [2] خوش معرکۂ زیبا ص ۲۴۴ [3] کارستان فصاحت مطبوعہ ۱۸۹۵ء

باندہ نے بہت قدر و منزلت فرمائی۔ اور زمرۂ مصاحبین خاص میں جگہ دی۔ جب باندہ میں اِن کا دیوان تیاری کے قریب پہنچا، تو شہر باندہ پر بھی آفتِ آسمانی نازل ہوئی۔ سب کچھ درہم برہم ہوگیا، اور دوسرا دیوان بھی اس آفت کی بھینٹ چڑھا۔ آخر میں موصوف عازمِ حیدر آباد ہوئے۔ وہاں پہنچنے پر پہلے تو جناب شہر یار الملک بہادر کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ بعد کو نواب میر خیرات علی خاں بہادر سخیؔ فرزندِ آغوشی روشن الدولہ بہادر رئیس حیدر آباد دکن بڑی دھوم دھام کے ساتھ موصوف کے شاگرد ہوئے اور ماہوار تنخواہ بھی مقرر فرمائی، اور اکل و شرب بھی نواب صاحب ممدوح کے ہمراہ قرار پایا۔ اب تو ذرا منتہیؔ کو سکون ملا۔ موصوف ایسے تیز طبع تھے کہ اگر چاہتے تو ایسے پُرسکون ماحول میں چند عرصے میں ہی مضامینِ نو کے انبار لگا دیتے مگر ضعیفی کی وجہ سے دس سال کے عرصے میں صرف پینتیس ۳۵ جز تصنیف فرمائے تھے کہ ۱۲۸۸ھ میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ نواب میر خیرات علی خاں بہادر سخیؔ نے منتہیؔ کے انتقال پر تاریخ کہی جو ذیل میں درج ہے:

قطعۂ تاریخ وفات میرزا مستبا بیگ منتہیؔ از نواب میر خیرات علی سخیؔ

منتہیؔ تیغِ جفا سے ناحق ہوگئے حیف کی جا ہے بے دم
دھیان تاریخ کا آیا جو سخیؔ لکھی تاریخ "تو اریخ الم"

۱۲۸۸ھ

قطعۂ تاریخ از لالہ انبالہ پرشاد ہنرؔ تلمیذ سخیؔ

از جہاں صد حیف چوں سوئے جناں یک بیک آں شاعرِ یکتا برفت
سالِ تاریخش چنیں گفتم ہنرؔ "منتہیؔ اے وائے از دنیا برفت"

۱۲۸۸ھ

منتہیؔ صاحب دیوان تھے۔ اِن کا دیوان کارستانِ فصاحت کے نام سے ۱۸۹۵ء میں مطبع یوسفی حیدر آباد سے شائع ہوا تھا۔ یہ دیوان ۳۳۸ صفحات پر مشتمل ہے سرورق اور مقدمے کے صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ اس میں تین سو ستر ۳۷۰ غزلیں

ہیں اور ایک قصیدۂ لامیہ در مدح "نواب مختار الملک بہادر مرحوم" آخر میں درج ہے
کلام میں عشق کی گرمی اور محبت کا سوز ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ متصوّفانہ مضامین اور شاعرانہ تخئیل کا فقدان ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔ اشعار میں روانی اور بندش میں چستی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

تا کمر گیسوے جاناں دیکھا — نصف طولِ شبِ ہجراں دیکھا
دن کو چرچا رہا بالوں کا ترے — رات بھر خوابِ پریشاں دیکھا
کچھ نہ ٹھہرا ترے رُخ کے آگے — بارہا سوئے گلستاں دیکھا

شیخ و زاہد سا جہاں میں کوئی خود مطلب نہیں — کی عبادت خوب سی لالچ جو پایا حور کا
ساقیا لا جلد تو جامِ شرابِ لالہ گوں — دھیان آیا ہے کسی کے دیدۂ مخمور کا
منزلِ ہستی میں آ ٹھہرا ہے دو دن کے لیے — منتہیؔ ورنہ مسافر ہے نہایت دور کا

بزمِ عشقِ یار میں غافل تھا یا فرزانہ تھا — اپنے اپنے حوصلے میں ہر کوئی دیوانہ تھا
روبرو سے اس کے آئینہ جدا ہوتا نہ تھا — شیفتہ آئینہ اپنا آپ وہ دیوانہ تھا
نیم وا تھی چشم وقفِ خواب اس بے خمار کی — بے خبر ساقی پڑا تھا وا درِ میخانہ تھا
دیکھتا ہوں اس گھڑی حسرت سے کیا سوئے فلک — جب کوئی کہتا ہے ہم تھے یار تھا پیمانہ تھا
روبرو میرے رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — عشقِ بت تھا یا چراغِ زیست کا پروانہ تھا
چھا گیا خوابِ عدم مجھ پر یکایک منتہیؔ — یہ نہیں معلوم ایسا کون سا افسانہ تھا

نگاہیں تری یاد آتی ہیں پیارے — کسی دم جو تیغِ دو دم دیکھتے ہیں
کوئی شے نہیں ایک صورت پہ رہتی — برابر حدوث و قدم دیکھتے ہیں
کدھر بت کہاں کے حسینِ زمانہ — ہر اک شکل میں تجھ کو ہم دیکھتے ہیں
لگی رہتی ہیں سوئے در اپنی آنکھیں — یہ کس شخص کی راہ ہم دیکھتے ہیں

زمانے میں یوں تو بہت سے ہیں خوش گو — مگر منتہیؔ سا بھی کم دیکھتے ہیں

پھر بہار آئی ہے پھر ہوتا ہے سودا دیکھو — دِل کھنچا جاتا ہے پھر جانبِ صحرا دیکھو
زلف ہے رخ کے قریں اور تماشا دیکھو — پاس کالے کے دھرا شیر کا پیالا دیکھو
لب پہ مرتا ہوں کبھی سبزۂ خط پر گاہے — حال کو میرے ذرا خضر و مسیحا دیکھو
دم بدم دیتا ہے ترغیب خیالِ جاناں — مجھ کو دیکھو مرے اس دل کا تقاضا دیکھو
پوچھتے کیا ہو مرے وحشتِ دل کی وسعت — اس کو دیکھو نہ کوئی دشتِ جنوں زا دیکھو

غم کھٹکتا نہیں اربابِ صفا کے گھر میں — موت کو دخل نہیں ہے شہدا کے گھر میں
سوزشِ عشق سے جب دم مرا گھبراتا ہے — دشت کو بھاگتا ہوں آگ لگا کے گھر میں
خاکساروں پہ کرم کرتے ہیں ادنیٰ اعلیٰ — رزقِ مزدور ہے ہر شاہ و گدا کے گھر میں

منہ پر کہنا تو ہے خوشامد — معشوق ہو خوب خوش ادا ہو
اے منتہیؔ بزمِ یار کا حال — کیا جانیے بعد میرے کیا ہو

روحِ رواں بدن سے کہیں کوچ کر گئی — بیدل کا ساتھ چھوڑ دیا ہے سوار نے
معشوق زندگی میں دیا، خلد بعد مرگ — کیا کیا کرم کیے مرے پروردگار نے

نادرؔ

نادر میرزا نام اور نادرؔ تخلص تھا۔ فن شعر گوئی میں حضرتِ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[1]۔ آغا حجو شرفؔ نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

---

[1] [illegible] لکھنؤ ص ۹۹۔

سنو نادر میرزا کا بیان | یہ سردار ہیں ابن شا میر خاں
ہمیشہ سے ہے نور دولہ خطاب | سرافراز نامی ہیں عالی جناب
سخاوت کا ان پر ہوا خاتمہ | شجاعت کا ان پر ہوا خاتمہ
وثیقے میں تنخواہ تھی نو ہزار | ڑکے ہیں تو ہیں آپ بے اختیار
تشاوبش انھیں چند در چند ہے | مگر فیض ان کا نہیں بند ہے
خدا ان کی تنخواہ جاری کرے | تشاویش سے رستگاری کرے
بڑے خاندانی، بڑے باکمال | یہ ہیں شاعروں میں عدیم المثال
یہ آتش کے شاگرد سردار ہیں | عجب دلفریب ان کے اشعار ہیں[1]

اس کے علاوہ نہ تو ان کا حال ہی معلوم ہو سکا۔ اور نہ کلام ہی دستیاب ہو سکا۔

نادرؔ

ڈاکٹر سید آغا نام اور نادرؔ تخلص تھا۔ فنِ شعر و شاعری میں حضرت آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے۔[1]

مؤلف تذکرۂ سخن شعرا کا بیان ہے کہ ان میں بہت بڑا عیب یہ تھا کہ دوسروں کے شعر کو اپنے نام سے پڑھتے تھے۔ مذکورہ تذکرے کی تالیف سے قبل ہی کلکتے میں انتقال کر گئے تھے۔ اس سے زیادہ حالات نہیں معلوم ہو سکے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

نگاہ جب کہ ادھر کی تو دل کے پار ہوئی | کبھی خطا نہ ترے تیر کا نشانہ ہوا

ے کشتی کا جو ہوا اس بتِ نوخط کو خیال! | خضر دریا سے لیے ہاتھ میں ساغر نکلا

تقدیر سے الجھا نہ میں تدبیر سے اُلجھا | الجھا تو تری زلفِ گرہ گیر سے الجھا

---

[1] افسانۂ لکھنؤ، ص ۹۹۔ [2] تذکرہ سخن شعرا، ص ۴۸۸۔

دل یار کے گیسوئے گرہ گیر سے اُلجھا　　دیوانہ جو اُلجھا بھی تو زنجیر سے اُلجھا

ناصر

میرزا نام اور ناصرؔ تخلص تھا۔ فنِ شعر و سخن میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[1]۔ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ حال نہ معلوم ہو سکا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

چشم و گردن کا تری شب بزم میں افسانہ تھا　　تھی تہی قالب صراحی، سرنگوں پیمانہ تھا
ہم سے وہ آئینہ رو کس طرح ہوتا صاف دل　　دور آہ اپنا غبارِ خاطرِ جانانہ تھا

نذرِ لحد بعدِ فنا ہو گئے　　ذین سے ہستی کے ادا ہو گئے
سینۂ خراشی سے کُھلا رازِ عشق　　ناخنِ غم عقدہ کشا ہو گئے
تیغ کا احسان مری گردن پہ ہے　　سیکڑوں مطلب یہ ادا ہو گئے
رو دیئے احوال پہ ناصرؔ کے کیا　　ہم بھی گرفتارِ بلا ہو گئے[2]

ندیم

بشارت علی نام اور ندیمؔ تخلص تھا۔ فنِ شعر و شاعری میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے۔ منشی برج بھوکن لال محب اپنی تصنیف تاریخ دریاباد میں ندیم کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں[3]: "بشارت علی نام، ندیم تخلص، سنی المذہب، سید مولوی مشرف علی صاحب

---

[1] خوش معرکہ زیبا ص ۴۱۵
[2] خوش معرکہ زیبا ص ۴۱۵ - ۶
[3] تاریخ دریاباد مطبوعہ نامی پریس ص ۴۳۔

کے بڑے بیٹے (چھوٹے بیٹے منشی سالار بخش تھے ماجھوں نے تقریباً اسی پچاسی برس کی عمر پائی۔ فارسی عربی کے جید عالم اور بڑے خوش نویس تھے) مشہور شاعر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد۔ دریاباد میں اردو شاعری کے بانی مبانی۔ ان کے قبل یہاں فارسی کے سوا کوئی اردو کے نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ یہی اوّل اور قابلِ فخر بزرگ ہیں جنہیں فارسی کے زمانۂ عروج میں ادب اردو سے محبت ہونے کے ساتھ ہی آتش جیسے نامی گرامی استاد سے شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا اور جن کے فیض سے دریاباد میں نہ صرف اردو کا رواج ہوا بلکہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو اس نئی انوکھی اور غیر مانوس زبان سے اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ انھیں اردو شعر گوئی کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو گیا۔

ندیم، فرنگی محل لکھنؤ میں علوم سے بہرہ یاب ہوئے تھے۔ عربی فارسی میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ رند، صبا، خلیل، نسیم وغیرہ کے ہم عصر اور ہم صحبت و ہم مشاعرہ تھے۔ اپنے استاد کے ہمراہ مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھتے تھے۔ یہ سخن ور ہونے کے علاوہ سخن فہم اور سخن دوست بھی تھے اور جس طرح اردو کے زبردست شاعر تھے اسی طرح فارسی کی انشا پردازی میں بھی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ فارسی خطوط پر مضمون اور نہایت اختصار کے ساتھ لکھتے تھے۔ جن کی عبارت رقعات عالمگیری سے ٹکر کھاتی تھی۔

یہ پہلے راجہ ٹکیت رائے (دیوان ولی عہد بہادر) کے یہاں ملازم ہوئے۔ بعد اس کے راجہ جیا لال گلشن (دیوانِ قدیم و مہتمم دفتر سلطانی بعہد محمد علی شاہ بادشاہ کی بے حد قدر دانی سے ان کے یہاں عرصے تک معتمدی پر مامور رہے۔ بعد غدر اپنے وطن آ کر رائے صاحب کے یہاں بہ حیثیت معلّم خدمات انجام دیں۔ ایک روز رائے شیوراج بلی کی زبان سے نکل گیا کہ "مولوی صاحب لڑکے گستاخ ہوئے جاتے ہیں!" یہ کلمہ سنتے ہی مولوی صاحب ناراض ہو کر اپنے گھر چلے آئے اور پھر تا عمر ان کی ڈیوڑھی پر نہیں گئے رائے صاحب کی ملازمت ترک کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے دیوان روشن لال صاحب

کے مکان پر اپنا ذاتی مکتب قائم کر دیا اور شرفا کے لڑکے تعلیم کے لیے آنے لگے اور اس طرح ایک آزادانہ گزر اوقات کی معقول صورت نکل آئی۔ اس درمیان میں راجہ صاحب سورج پور نے اپنے لڑکے کی تعلیم کے لیے شیخ کرم کریم عرف جھیدا میاں (جن سے قرب وجوار کے رئیسوں سے دوستانہ مراسم تھے) کی معرفت ان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ ہمارے یہاں ملازمت قبول کر لیں تو ہم پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ دینے کو تیار ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے جواب میں صاف کہہ دیا کہ "ہم نے کالیتھوں کی نوکری کی ہے وہی ہمارے قدرداں ہیں۔ جب ہم نے ان کی نوکری چھوڑ دی تو اب گنواروں کی نوکری کرنا شان کے خلاف ہے۔

چند روز کے بعد ہائی اسکول دریاباد میں دوسری زبان کی تعلیم کے لیے نسفیلڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کی قدردانی سے کم تنخواہ پر بایں شرط ملازمت اختیار کی کہ میں اسکول میں نہ جاؤں گا۔ لڑکے خود میرے مکتب میں تعلیم کے لیے آیا کریں۔ چنانچہ جب تک اسکول قائم رہا اسی طرح اپنے مکتب میں طلبہ کو تعلیم دیتے رہے۔ دوران ملازمت میں بارہا حکام نے ان سے کہا کہ اگر آپ اسکول میں جاکر تعلیم دیں تو تنخواہ زیادہ کر دی جائے گی۔ لیکن انھوں نے اسے منظور نہیں کیا۔ ورنا کیولر مڈل اسکول قائم ہونے پر اعلیٰ درجے کے طالب علموں کو اردو زبان کی تعلیم دینے لگے اور تا زندگی اپنے قول کی پابندی کے ساتھ علمی خدمت میں مشغول رہے۔

ندیم، متوسط قد، گندمی رنگ، لاغر اندام، نہایت خلیق و باوضع بزرگ تھے۔ غالباً اسّی سال کی عمر پائی۔ ۱۸۷۵ء میں انتقال ہوا۔ اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی جس کی اولاد میں علی حسین صاحب تھے، جو بعد کو ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں رہنے لگے تھے۔ شاگردوں[1] ماتا پرشاد ساغرؔ، مرتضیٰ بیگ فرحتؔ مشہور ہوئے۔ ایک شعر جو مولوی ثابت علی صاحب کی زبانی سننے میں آیا تھا وہ درج کیا جاتا ہے ؎

بے شک یہ فیض حضرتِ آتش کا ہے ندیمؔ ۔۔۔ جو شاعروں میں آج ہمارا شمار ہے[1]

---

[1] تاریخ دریاباد ص ۵۰

راقم کو اس سے زیادہ نہ تو حالات معلوم ہوئے، اور نہ ہی کلام دستیاب ہو سکا۔

نسیمؔ

پنڈت دیا شنکر نام اور نسیمؔ تخلص تھا۔ والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا، جو کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نسیمؔ ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کشمیری محلہ لکھنؤ میں سکونت تھی۔ پستہ قامت گندمی رنگ، سیاہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے[1] عام دستور کے مطابق اردو کی تعلیم صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اردو کا کلام برابر نظر سے گزرتا رہا۔ بچپن ہی سے طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔

خواجہ آتشؔ کا رنگِ سخن پسند آیا اور انھیں کے شاگرد ہو گئے[2] اپنے ہم عصروں میں بڑا نام پیدا کیا۔ ابھی صرف بتیس۳۲ سال کی عمر تھی کہ عین عالمِ شباب میں ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں رحلت کر گئے۔ عاشقؔ لکھنوی نے تاریخ وفات نظم کی ہے

کشیدہ آہ بہ گفتا نسیمِ باغِ جناں[3]

مثنوی گلزارِ نسیم ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸-۳۹ء) میں تمام ہوئی۔ مصنف نے تاریخ بھی خود ہی نظم کی تھی۔ مصرعِ تاریخ یہ ہے

توقیعِ قبول روزِ بیش باد

مثنوی گلزارِ نسیم کی کہانی گل بکاؤلی[4] کے مشہور قصے پر مبنی ہے، جسے اور بھی کئی باکمال فن کاروں نے نظم یا نثر کا جامہ پہنایا تھا۔ سب سے پہلے عزت اللہ بنگالی نے اس کہانی کو فارسی نثر میں ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں پیش کیا تھا[5] اس کے بعد گل کرسٹ کی فرمائش پر منشی نہال چند لاہوری نے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں مذہبِ عشق کے نام سے اس کا اردو نثر میں ترجمہ کیا

---

[1] مقدمہ گلزارِ نسیم ص ۲ (مرتبہ اصغر گونڈوی مطبوعہ ۱۹۲۳ء) [2] تذکرہ سخن شعرا ص ۵۱۸
[3] مثنویاتِ دبستانِ لکھنؤ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ قلمی از سلیمان حسین ص ۱۲۲ [4] اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۴۴۳

جو پہلی بار ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔

اور پھر نسیمؔ نے ۱۲۵۴ھ میں اس دل چسپ داستان کو اردو نظم میں پیش کیا، اور اپنے کمالِ فن سے اس مثنوی کو زندہ جاوید بنا دیا۔ نسیمؔ نے خود اس بات کی صراحت کی ہے:

ہر چند سنا گیا ہے اِس کو ۔۔۔ اردو کی زبان میں سخن گو
وہ نثر ہے دردِ نظم دِل میں ۔۔۔ اِس مے کو دو آتشہ کروں میں

اس کے علاوہ بھی بعض شاعروں نے اسی قصّے کو نظم کیا ہے۔ ۱۲۱۱ھ میں ایک غیر معروف شاعر ریحان اللہ بن خاں ریحاںؔ نے اِسی گل بکاؤلی کے قصّے کو نظم کیا۔ مگر یہ مثنوی مقبول نہ ہو سکی۔[۱] گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ اُس کا نام "خیابانِ ریحان" تھا مگر اخبار مخزن کے تبصرہ نگار نے اُس مثنوی کا نام باغ و بہار بتایا ہے۔ پھر ۱۲۶۱ھ میں رفعتؔ لکھنوی نے بھی اسی قصّے کو ایک مثنوی کی شکل میں پیش کیا۔ مگر یہ مثنوی بھی مقبول نہ ہو سکی۔[۲]

گلزارِ نسیم کا پہلا ایڈیشن لکھنؤ کے مطبع میر حسن رضوی میں ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہی اس مثنوی کا واحد معتبر ایڈیشن ہے۔ اس نسخے کے آخر میں خاتمۃ الطبع کی جو عبارت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایڈیشن نسیمؔ کی نگرانی میں چھپا تھا:۔

"در مطبع حسینی سیدی سندی میر حسن رضوی ... بہ تصحیح و مقابلہ مصنّف حلیہ طبع پوشید۔" آخر میں نسیمؔ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ طبع بھی شامل ہے جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:

چوں زیور طبع نیک پوشید ۔۔۔ بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع ۔۔۔ گل گفت کہ "تازہ گشت مطبوع" (۱۲۶۰ھ)

اس کے بعد اس مثنوی کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، جن میں مطبع مصطفائی کا نسخہ مطبوعہ ۱۲۶۴ھ مطبع نظامی کا نسخہ مطبوعہ ۱۲۶۷ھ اور مطبع آصفی کان پور کا نسخہ مطبوعہ ۱۲۷۸ھ قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۰۵ء میں برج نرائن چکبستؔ نے اس مثنوی کا ایک بہت عمدہ ایڈیشن ایک طویل

۱؎ رسالہ مخزن۔ نومبر ۱۹۰۸ء ۲؎ مثنویاتِ دبستانِ لکھنؤ سلیمان حسین پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ ص ۱۲۲

مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ یہی ایڈیشن معرکہ چکبست و شرر کی بنیاد بنا، اور ایک عرصے تک اعتراضات اور جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔

اس سلسلے کے مضامین کا مجموعہ ایک کتابی شکل میں معرکۂ چکبست و شرر کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ طوالت کے باعث اس معرکے کی تفصیل یہاں دینا مناسب نہیں۔

یوں تو شمالی ہند میں اردو کی بہت سی مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر قبول عام کا شرف صرف دو مثنویوں کو حاصل ہوا۔ میر حسن کی سحر البیان اور نسیم کی گلزار نسیم۔ میر حسن نے مناظر کی مصوری، مرقع نگاری، اور جذبات نگاری میں یقیناً کمال دکھایا ہے۔ لیکن چونکہ داستان اُن کے اپنے ذہن کی پیداوار تھی، اور انھیں موقع محل سے ضرورت کے مطابق قصّے کو توڑ مروڑ کے پیش کرنے کا پورا پورا اختیار تھا۔ نسیم چونکہ دوسرے کی لکھی ہوئی داستان کے پابند تھے، اور اس ترمیم و تحریف کی قطعی گنجائش نہ تھی، اس لیے نسیم نے ایک محدود دائرے میں رہ کر سخت قیود کے ساتھ نازک خیالی، نقش طرازی، اور معنی آفرینی کا جو حسین مرقع پیش کیا ہے، وہ صرف انھیں کا حصّہ ہے۔

نازک خیالی کا کمال ملاحظہ فرمائیے:۔

چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں   کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں

سیّاح کو کیا قیام سے کار   شبنم نہیں جاگزینِ گلزار

جو نخل تھا۔ بیچ میں کھڑا تھا   جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا۔

الفاظ کی سادگی اور قافیوں کی چستی پر ایک نظر ڈالیے:۔

تو باغِ ارم سے لے گیا گل   تو مجھ سی پری کو دے گیا جُل

تجھ کو ترے باپ سے ملایا   مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا

جو جو اسرار تھے نہانی   سب تجھ سے سنے تری زبانی

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے   جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

لفظوں کا اختصار اس مثنوی کا بے مثال کرشمہ ہے۔ نسیم نے صرف اتنے ہی الفاظ استعمال کیے ہیں، جو مفہوم کو ادا کرنے کے لیے از حد ضروری تھے۔

الفاظ کے اختصار کے ساتھ ساتھ، بندش کی چستی کا بھی لحاظ رکھنا انھیں کا حصہ ہے۔ یہ خصوصیت میر حسن کی سحرالبیان تک میں ناپید ہے۔ نسیم کے یہاں اگر ایک شعر بھی درمیان سے حذف کر دیجئے، تو ساری داستان بکھری ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اب چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

طوطا بن کر شجر پر آکر | پھل کھا کے بشر کا روپ پاکر
پتے، پھل، گوند، چھال، لکڑی | اس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

گھر بار سے کیا فقیر کو کام | کیا لیجیے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ قسمت | پوچھا کہ طلب؟ کہا، قناعت

تنہا اسے دیکھ کر کہا "ہیں!" | محمود کیا ہوئیں، کہا "ہیں"
یہ کہہ کے اٹھا کہا کہ لو جان | جانے ہیں کہا خدا نگہبان

جھنجھلا کے، ڈر گئے، غل مچا کے | سمجھا کے، دبا کے دست و پا کے
من چیں کے چوری کے بہانے | بھیجا کھلے بندوں قید خانے

نسیم ایک عورت کے مرد بن جانے کا مفہوم اس طرح ادا کرتے ہیں۔

تھالے میں یہاں اُگا صنوبر | واں شیشہ رہا ترش کے ساغر

یہ اختصار یقیناً بے مثال ہے۔

مصوری کی شان ملاحظہ ہو۔ راجہ اندر پریوں سے بکاؤلی کا حال پوچھتا ہے

اک شب تھا راجہ محفل آرا | یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے | شہزادی بکاؤلی کدھر ہے

منہ پھیر کے ایک مسکرائی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

یقیناً یہ مصوری اردو ادب میں انفرادیت کا درجہ رکھتی ہے۔

گلزار نسیم میں واقعہ نگاری کی شان بھی انوکھی اور بے مثال ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

روح افزا نے کہا بہن سے　　بہتر کوئی جا نہیں چمن سے
گل گشت کریں چلو کہا خیر　　کیا جانے کہ ہوگی سیر میں سیر
چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا　　کھونا ملنا بہن یہ کیا تھا
روح افزا نے کہا کہ ہمشیر　　میں نے یہ سنا کہ تو ہے دل گیر
واللہ کہ چھان کر خدائی　　تیرے پیارے کو ڈھونڈ لائی
سمجھی وہ ہنسی کہا سڑن ہو　　نادان ہو کیا کہوں بہن ہو
ہم کو یہ ہنسی نہیں گوارا　　پیارا ہوئے گا وہ تمہارا
پیارا جو نہ تھا تو کھو گئیں کیوں　　بدراہ بھی آپ ہو گئیں کیوں
بولی وہ آشنا تمہارا　　پیارا نہیں پیارے کا ہے پیارا
گر اُس کی تلاش میں میں کھوئی　　بدراہ نہ کہہ سکے گا کوئی
جو چاہو کہو جواب کیا دوں　　قائل نہیں ہوتی ہو دکھا دوں
وہ جوگی، وہ دھونی اور وہ آسن　　دکھلایا تو تھی اُسی کی جوگن

تاج الملوک اور بکاؤلی کے وصل کے واقعے کو اس طرح نظم کیا ہے۔

یہ کہہ کے لبوں نے قند گھولے　　ہستی نے دلوں کے عقدے کھولے
کاوش پہ ہوا گہر سے الماس　　غنچے نے بجھائی اوس سے پیاس
واں غنچہ یاسمیں تھا گل نار　　یاں دامن سرو ارغواں زار
واں صبح صفا تھی گل بداماں　　پھولی رخ مہر پر شفق یاں
کیا آگے لکھوں کہ اب سر دست　　ہوتا ہے دوات میں قلم مست

جذبات نگاری کا کمال ملاحظہ فرمائیے:۔

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گُل ہوا ہوا ہے۔
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل؟
جھنجھلائی! کہ کون دے گیا جُل

ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نتھرائیں خواصیں صورتِ بید
اک ایک سے پوچھنے لگی بھید

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ نہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چُرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہ ہی چشمِ حوض کا تھا

نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا

مختصر یہ کہ مثنوی گلزارِ نسیم کو اردو مثنویات میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس مثنوی کا ہر شعر مرصّع ہے۔ مضمون کی باریکی، زبان کی پاکیزگی، الفاظ کا اختصار، معنی کی ندرت، تلازمہ کی رعایت، اور اشارات و کنایات کا طلسم، ایک ایک مصرع پر ختم ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ بحر چھوٹی ہے۔ سخن مختصر ہے، مگر مطلب اور مفہوم اس میں ایک جہان کا بھر دیا ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

مصنف تذکرہ کاشف الحقائق نے نسیم کے کمالِ فن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"زبان کی خوبی، بندش کی چستی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ گلزارِ نسیم میں مثنوی میر حسن جیسی فطری خوبیاں کم ہیں۔ اس کی نظم حیرت انگیز اختصار کا عالم رکھتی ہے اس پر بھی ادائے مطلب کا ایسا جلوہ دکھاتی ہے کہ شاید و باید خوبئ نظم اور عمدگئ زبان لائق تحسین ہے"[1]

---

[1] کاشف الحقائق حصہ دوم ص ۵۴۰ مصنفہ امداد امام اثر

جناب گوپی چند نارنگ نسیم کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:۔

"دیا شنکر نسیم بلا کے ذہن اور طباع آدمی تھے زبان و بیان پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بیس ۲۰ پچیس ۲۵ برس کی عمر میں فن شعر میں وہ کمال پیدا کیا کہ ان کی مثنوی اردو کے زندۂ جاوید کارناموں میں شمار کی جاتی ہے۔ نسیم بلاغت اور معنی آفرینی پر جان چھڑکتے تھے۔ میر حسن کا سا سوز و گداز ان کے پاس نہیں۔ نہ ہی وہ روزمرے اور محاورے کے بادشاہ ہیں۔ لیکن شوکتِ الفاظ، اختصار، تناسب لفظی، بلند پروازی، نازک بینی، استعاروں کی نزاکت اور تشبیہوں کی پختگی میں اُن کا ایک خاص رنگ ہے۔ وہ لکھنؤ کی رنگین، لوچدار اور مرصع زبان کے نمایندہ شاعر ہیں۔ طبیعت چونکہ مشکل پسندی پر مائل تھی۔ سلاست اور گھلاوٹ ان کے کلام میں نہیں۔ البتہ کہیں کہیں تکلفات سے ہٹ کر بڑے ہی سادہ اور برجستہ شعر کہے ہیں جو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں"[۱]

اس مثنوی کے بہت بڑے نکتہ چیں عبدالحلیم شرر مرحوم کے مضامین سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ مولانا بھی اپنے اعتراضات کے باوجود، نسیم کے کمالِ فن کا لوہا مانے بغیر نہ رہ سکے:۔

"گلزار نسیم کو جو مقبولیت حاصل ہوئی حیرت انگیز ہے۔ لیکن اس کی خوبیوں کا اندازہ کیا جائے تو یہ بے انتہا شہرت بھی اس کے مرتبے سے کم ہے۔ اردو ہی نہیں اکثر زبانوں میں اِس پایے کی نظمیں کم ملیں گی"[۲]

"جس وقت اس کے محاسن پر نظر ڈالی جائے، تو اس قدر لطف آتا ہے کہ مجبور ہو کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس سے اچھی نظم نہیں ہو سکتی"[۳]

یہ ضرور ہے کہ گلزارِ نسیم میں بعض خامیاں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے اور تقاضائے بشریت کے تحت اُن کو بُھلایا جا سکتا ہے اصل یہ ہے کہ نسیم کے کمالِ فن پر ان لغزشوں

---

[۱] اردو مثنویاں ص ۲۳۳ [۲] معرکہ چکبست و شرر طبع دوم ص ۵۴ [۳] ایضاً

سے حرف نہیں آتا۔

نسیم نے مثنوی گلزارِ نسیم کے علاوہ ایک مکمل دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے ان کے انتقال کے بعد یہ دیوان شائع ہو سکا۔ راقم کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ سورج بلی صاحب ساکن دوگانوال لکھنؤ کی فرمائش سے مطبعِ گلشنِ فیض لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس دیوان کا نام "انتخاب باغِ گلزار معروف بہ دیوان نسیم" ہے۔ یہ سڑسٹھ ۶۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دیوان میں نواسی ۸۹ غزلیں چھ ۶ مخمس، دو ۲ ترجیع بند، چار ۴ فارسی خمسہ جات، ایک مستزاد اور انیس ۱۹ بندوں پر مشتمل ایک واسوخت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نسیم نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شعر گوئی کے علاوہ، نسیم فارسی میں بھی مشقِ سخن کرتے تھے۔ مگر فارسی کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ چند مخمس ہیں جو مذکورہ دیوان میں موجود ہیں۔

نسیم کو فی البدیہہ کہنے میں خاص ملکہ تھا۔ ایک بار خواجہ آتش نے ایک غزل فی البدیہہ کہی جس کا مطلع یہ ہے:

ذہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے　　کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

نسیم نے اس غزل کی اُسی وقت تخمیس کر دی۔ ادھر آتش کا شعر پورا ہوا، ادھر نسیم نے تین مصرعے لگا لیے[1] آتش کی مذکورہ غزل میں چودہ اشعار ہیں۔ نسیم نے پوری غزل پر تخمیس کی ہے، جو دیوان میں موجود ہے۔ نمونے کے لیے دو بند ملاحظہ ہوں:

زمانے میں ہیں نکتہ داں کیسے کیسے　　خط و خال کے ہیں بیاں کیسے کیسے
زباں زد ہیں وصفِ بتاں کیسے کیسے　　ذہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
سخن آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

نہ خونیں کفن ہیں نہ گھائل ہوئے ہیں　　نہ زخمی بدن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں
لہو مل کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں　　تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

---

[1] مرآۃ الشعراء جلد اول ص ۵۳۱

ایک بار شیخ ناسخ نے نسیم سے مخاطب ہوکر کہا، پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرع نہیں سوجھتا، کہ پورا شعر ہوجائے۔ آپ نے جواب دیا فرمایئے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا۔ "شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا" منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ نسیم نے فوراً مصرع لگایا۔ "تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا" اس مصرع کا سننا تھا کہ حاضرین محفل واہ واہ کے نعرے بلند کرنے لگے۔[1]

اسی طرح ایک شخص نے مشاعرے میں ایک شعر پڑھا، جس کا دوسرا مصرع تھا۔ "جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں" نسیم کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرع تو خوب ہے لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہیں۔ وہ صاحب جھنجھلا کے بولے آپ اس سے بہتر مصرع لگا دیجئے۔ نسیم نے اسی وقت درج ذیل مصرع لگا دیا۔

"تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں" جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

نسیم کی غزلیں زیادہ مقبول نہ ہوسکیں، اور ان کا دیوان گم نامی کے عالم میں رہا برج نرائن چکبست کا کہنا ہے کہ نسیم کی غزلوں میں بعد کو لوگوں نے اپنی طرف سے بعض اشعار کا اضافہ کردیا۔ ہوسکتا ہے کہ چکبست کی یہ بات درست ہو۔ مگر اس بات میں کوئی شک نہیں، کہ نسیم کے دیوان میں ان کا خاص رنگ طبیعت صاف عیاں ہے۔ وہی نازک خیالی، بندش کی چستی، معانی کی ندرت اور زبان کی پاکیزگی (جو مثنوی گلزار نسیم کی نمایاں خصوصیات میں سے ہے) ان کی غزلیات میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ قارئین نمونۂ کلام سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار کس حد تک نسیم کے مخصوص رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا ۔ روح رواں و جسم کی صورت میں کیا کہوں
یہ چاند اس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا ۔ سمجھا ہے حق کو اپنی ہی جانب ہر ایک شخص

---

[1] مرآۃ الشعراء جلد اول ص ۵۳۱

صدف وابرِ گہر بار کو دیکھا تو کہا — عالمِ آب میں بھی ہوتے ہیں پیاسے پیدا

کان میں سب کے اپنی بات نہ ڈال — آبرو شلِ آب گوہر ہے،

بوئے گل غنچے سے کہتی ہے نسیم — بات نکلی منہ سے افسانہ چلا

نسیم اس چمن میں گلِ تر کی صورت — پھٹے کپڑے رکھتے ہیں پردہ ہمارا

پیری میں طرزِ عشقِ جوانی وہی رہا — صورت کے ساتھ دل کا بدلنا محال تھا
شکرِ خدا بتوں سے ہوئیں گرم جوشیاں — پتھر کا شلِ شیشہ پگھلنا محال تھا
کیا گرمئ خیال سے صورت بندھی نسیم — اُس سیم تن کا سانچے میں ڈھلنا محال تھا

نسیم دزدئ مضموں نہ چھوڑیں گے شعرا — اگرچہ شہر کا تبدیل کوتوال ہوا،

چمن میں گل نے کہیں دعوئ جمال کیا — جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا

دل بدل آئینہ ہے دیر و حرم — حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف
خواہ کعبے خواہ بت خانے کو جا — دشتِ دل کا رہ گزر ہے دو طرف
کفر و ایماں دونوں جانب کی سنے — اس لیئے گوشِ بشر ہے دو طرف

باغِ جہاں میں خاک کوئی فیض یاب ہو — غنچے کی مٹھی بند ہے گل باد دست ہے

ساقی قدحِ شراب دے دے — مہتاب میں آفتاب دے دے

منت دلا کسی کی نہ اصلا اٹھائیے ۔۔۔ مر جائیے نہ ناز مسیحا اٹھائیے
کس کا حجاب، کس کی حیا اور کہاں کی شرم ۔۔۔ پردے سے ہاتھ ہاتھ سے پردا اٹھائیے

مستزاد

چاک کا تار بندھا کب ہے اے جوشش جنوں ۔۔۔ ہاتھ اٹھا بس کہیں اب
جیب کے ٹکڑے ہیں دامن میں کوئی تار نہیں ۔۔۔ پردہ کھلتا ہے مرا
خاکِ صحرا کی بھی خاطر یہ ہوا ہوں میں غبار ۔۔۔ صورتِ نقشِ قدم
بیٹھنے کا مرے یاں کوئی روادار نہیں ۔۔۔ اے فلک مجھ کو اٹھا
اور بھی کچھ ترے کوچے سے سروکار نہیں ۔۔۔ رہنے دے مجھ کو پڑا
کیا کہا کرتے ہو ہر ایک سے آئے نہ نسیم ۔۔۔ یہ توقع تو نہ تھی
خوش رہو کیا کوئی دنیا میں طرحدار نہیں ۔۔۔ کہنے سے ہو گے خفا

خمسۂ فارسی

زانکش فگند حسن تو پرکالہ درچمن ۔۔۔ شد دورِ جام شعلۂ جوالہ درچمن
شبنم بشیشہ می فگند ژالہ درچمن ۔۔۔ از انفعال لعل لبت لالہ درچمن
دیگر بدست خویش نگیرد پیالہ را

ہر کس کہ بوے عشق ازیں بوستاں شنید ۔۔۔ فریاد و درد و نالہ و آہ و فغاں شنید
دستاں زدست ہر کہ زغم داستاں شنید ۔۔۔ اوصاف گل زبلبلِ بے دل نواں شنید
چوں مثل او نخواند کسے ایں رسالہ را

اے آسمانِ حسن چو تو کیست بر زمیں ۔۔۔ سیارہ خال و زلف شب و کہکشاں جبیں
تنہا بہ حسن حسن و صفا یافتے ہمیں ۔۔۔ آمد بروں بگرد رخت خطِ عنبریں
کس گرد مہ ندید بدیں گونہ ہالہ را

پرسی چہار عشق کنم بر تو عقدہ باز ۔۔۔ سازا ست بہر سوز نیاز است بہر ناز

زار است اے نسیم انہ آنجا کہ قلب راز آزردہ کے کنند دلِ محمود را ایاز
نیکو کند مطالعہ گر ایں رسالہ را

نصرتؔ

میرزا محمد جعفر نام اور نصرتؔ تخلص تھا۔ والد کا نام اچھے صاحب اور دادا کا نام نواب قاسم علی خاں تھا۔ فنِ شعر گوئی میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے[1]۔ اِس سے زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

پان کی لالی سے لب لعلِ بدخشاں ہوگیا حب ملی منہدی تو پنجہ رشکِ مرجاں ہوگیا
اس پری نے ہاتھ کی اپنے انگوٹھی دی جسے قاف تک مشہور نام اس کا سلیماں ہوگیا
پان کھاکر آئنہ دیکھا جو اس محبوب نے عکس لب سے آئنہ لعلِ بدخشاں ہوگیا
حسن پر نہ اپنے کیوں کر یار کو ہووے غرور اس پری کا شیفتہ نصرتؔ سا انساں ہوگیا

خلد کا سیب ترے سیب ذقن کے بدلے حور بھی دے تو نہ لوں ہاتھ سے اپنے نصرتؔ

نمودؔ

میر مہدی حسن نام اور نمودؔ تخلص تھا۔ میر عباس علی لکھنوی کے بیٹے تھے[2]۔ فنِ شعر گوئی میں خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[3]۔ آغا جو شرفؔ نے اپنی تصنیف افسانۂ لکھنؤ میں نمودؔ کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

---

[1] تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ص ۱۸۸۔ [2] تذکرۂ سخن شعرا ص ۴۷۵۔ [3] افسانۂ لکھنؤ قلمی ص ۱۱۶

جو مہدی حسن ہیں سیادت پناہ | شرف نجابت کی ہے دست گاہ
یہ شاگرد آتش کے ہیں خوش بیان | نہ ہو شستہ و رفتہ کیوں کر زباں
تخلص نمود اور نمودار ہیں | معزز ہیں، حاجی ہیں، زوار ہیں
جو اک بھائی ہیں ان کے حیدر حسین | خدا کی عنایت سے کرتے ہیں چین
یہ رتبہ عطائے خدا سے ملا | شرف کعبہ و کربلا سے ملا

اس سے زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے۔ تذکرۂ خوش معرکہ زیبا میں ایک غزل درج ہے جو قارئین کی نذر ہے۔

صدمے کہاں حضور کو میرے ملال کے | چھینٹا نہ دیجیے آنکھ سے آنسو نکال کے
زینے نہ طے ہوئے ترے بام وصال کے | تھک تھک گئے ہیں پاؤں ہمارے خیال کے
لازم ہے اپنی لاش گڑے کوہ طور پر | مارے ہوئے ہیں ہم تری برق جمال کے
نقشہ نہ جب کھنچا خم ابروئے یار کا | بہزاد نے بنا دیے نقشے ہلال کے
کیا میں شب فراق کی حالت بیاں کروں | رہ رہ گیا ہوں ہاتھوں سے دل کو سنبھال کے
آنکھیں بچھی ہیں راہ میں ہر اہل دید کی | رکھیے قدم زمیں پہ ذرا دیکھ بھال کے
کس کا گدائے در ہے شب و روز آسماں | خورشید و ماہ ہیں دونوں کاسے سوال کے
رونے ہی کے سبب سے مری آبرو گئی | خالی صدف کو کر دیا گوہر نکال کے
طول شب فراق سے گھبرا نہ اے نمود | آثار ہوتے جاتے ہیں روز وصال کے

واہبؔ

شیخ حیدر نام اور واہبؔ تخلص تھا۔ فیض آباد میں رہتے تھے۔ ستار نوازی کا بہت شوق تھا۔ فن شعر و شاعری میں یہ خواجہ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے[1]۔ اس سے زیادہ راقم کو حالات نہ معلوم ہو سکے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

---

[1] تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ص ۱۵۱۔

سینے کے داغوں کی گرمی سے گریباں جل گیا
آب اشکِ آتشیں سے اپنا داماں جل گیا
ضبط کرتے کرتے وحشت میں جو اُف میں نے کیا
خار و خس چھکنے لگے بیدِ بیاباں جل گیا

تدبیر سے تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا
فرہاد کو شیریں نہ ملی کوہ کنی سے
عاشق ہوں میں آزاد نہیں ہوں مجھے کیا کام
رومال سے، سیلی سے، چھڑی سے کفنی سے

وصفیؔ

میر سرفراز علی نام اور وصفیؔ تخلص تھا۔ الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن ترکِ وطن کے بعد الہ آباد سے منتقل ہوکر حیدرآباد میں جا کر ملازمت کر لی تھی۔ اردو شعر و سخن میں حضرتِ آتشؔ سے اصلاح لیتے تھے۔[۱] ۱۲۹۷ھ میں وہیں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ اس سے زیادہ نہ تو ان کے حالات معلوم ہو سکے اور نہ ہی نمونۂ کلام دستیاب ہو سکا۔ احمد حسین مائلؔ ان کے لائق شاگردوں میں تھے۔

یاسؔ

امداد حسین نام اور یاسؔ تخلص تھا۔ سادات عظام سے تھے۔ فن شعر گوئی میں خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے۔[۲] اس سے زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دلِ بے تاب کے ہم شکل اگر دِل ملتا
چین تم کو کبھی نہ اے حورِ شمائل ملتا
زندگی تلخ ترے ہجر میں اے جاں ہے مری
کھا ہی جاتا جو کہیں زہر ہلاہل ملتا

---

۱ تذکرۂ یادگار ضیغم ص ۳۰۴۔ ۲ تذکرۂ یادگار ضیغم ص ۲۷۶۔

کیا کسی زہرہ شمائل پہ طبیعت آئی — بے وفا سب ہیں نہیں ان سے مرا دل ملتا
کس سے درخواست تلمذ کی میں اے آتش کروں — کوئی شاعر نہیں آتش کے مقابل ملتا

یوسف

یوسف خاں نام اور یوسف تخلص تھا۔ والد کا نام رحمت خاں غوری تھا۔[1] لکھنؤ کے باشندے تھے۔ فن شعر و سخن میں خواجہ آتش سے اصلاح لیتے تھے۔[2] دستیاب شدہ کلام سے رنگیں بیانی اور شیریں زبانی عیاں ہے بلاحظہ ہو:

رخ قمر سے زیادہ ہیں آب و تاب میں پاؤں
نہ دیکھے چشم ملک نے بھی ایسے خواب میں پاؤں

جنوں میں لاکھ پھرا شکل مرغ قبلہ نما — کبھی نہ گھر سے ہوئے باہر اضطراب میں پاؤں

نہیں کچھ احتیاج روشنی شمع کافوری — چراغ داغ دل جلتا ہے میرے خانہ تن میں

شب وصلت کی سحر جب کہ نمایاں ہوگی — تن جدا جاں سے اور تن سے جدا جاں ہوگی
چشم جانانہ کا صحرا میں جو آئے گا خیال — کشت دل اپنی چراگاہ غزالاں ہوگی
سیر گلزار سے افزوں اسے سودا ہوگا — راس دل کو نہ ہوائے چمنستاں ہوگی
دل سے یوسف کے نہ جائے گا خیال خوباں — یہ حویلی نہ کبھی دیکھنا ویراں ہوگی

کاٹا پہاڑ دل میں نہ شیریں کے گھر کیا — پتھر ترے نصیب پہ اے کوہکن پڑے
گھر سے نکالا غیر کے کہنے سے آپ نے — اب جا کے کس جگہ یہ غریب الوطن پڑے

---

[1] تذکرۂ سراپا سخن ص ۳۶۵۔ [2] خوش معرکہ زیبا ص ۶۵۔۴

باب پنجم

تلامذہ آتش کی شاعرانہ خصوصیات

گزشتہ صفحات میں خواجہ آتش کی شخصیت اور فن پر ہلکے ہلکے اشارے کیے جا چکے ہیں اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ انھوں نے عام لکھنوی شعرا کی طرح ماحول اور سماج کے برے اثرات کو قبول نہیں کیا، وہ نہ تو سودا سے متاثر ہوئے اور نہ جرأت کی شاعری کے قریب پھٹکے، نہ جنسی محبت کی اور نہ جنسی شاعری کو منھ لگایا۔ ان کی شاعری میں جو عناصر غالب نظر آتے ہیں وہ داخلی عناصر ہیں وہ محبت کے صرف ماتم گسار نہیں بلکہ ان کے کلام میں دردمندیوں کا ایک نشاطی پہلو بھی نظر آتا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کا کلام خارجی اثرات سے خالی ہے وہ اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ یقیناً ان کے کلام میں معاشرتی روایات کا عکس ملتا ہے لیکن رکاکت اور ابتذال سے ان کا دامن پاک ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر جب ہم کلام آتش کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے کلام میں حسن کی لطافت اور عشق کی عظمت، ساز قلب کے لطیف تاروں کو مرتعش کرتی نظر آتی ہے، آتش کے جذبات کی شورش اور اس کی تیز نشتریت نے اردو زبان کے ادبی اقدار کو پست نہیں ہونے دیا اور نہ فصاحت کو زوال کی طرف مائل کیا بلکہ الفاظ کی سبک روی لب و لہجے کی نرمی و شیرینی اور سوز و گداز کی دھیمی کیفیت نیز تصوف کی چاشنی نے آتش کے کلام میں ایک منفرد آہنگ پیدا کر دیا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے

کہ ان کے کلام میں دہلی کی روایتِ شعری بھی ہے اور لکھنوی رنگِ سخن بھی۔

یہ ایک تفصیلی موضوع ہے' یہاں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آتش کے کلام میں جو محاسن پائے جاتے ہیں اور جن خوبیوں کی بدولت اردو شاعری کی تاریخ میں وہ ایک منفرد مقام کے حامل نظر آتے ہیں اس کا پرتو ان کے تلامذہ پر کس حد تک پڑا اور وہ کس حد تک متاثر ہوئے۔

جہاں تک خواجہ آتش کے تلامذہ کا تعلق ہے تو ان کی ایک جامع فہرست پچھلے باب میں دی گئی ہے لیکن ان تلامذہ میں رند' صبا' نسیم' کیف' خلیل' شوق' منتہی اور آغا حجو شرف کو جو مقام حاصل ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کی شاعرانہ خصوصیات کیا ہیں اور ان باکمال شعرا نے اپنے استاد خواجہ آتش کی کس حد تک پیروی کی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے لگایا جاسکتا ہے۔

سلاست و سادگی و روانی

خواجہ آتش کے کلام میں' سب سے بڑی خصوصیت سلاستِ زبان کی تھی' وہ مشکل پسندی' اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے' ان کے شاگردوں نے بھی اپنی شاعری میں اس وصف کو خاص جگہ دی ہے۔ اور ان کا کلام بھی اکثر و بیشتر مرصع سازی اور بناوٹ سے پاک ہے۔ تلامذۂ آتش فارسی مرکبات' اور عربی کے ادق الفاظ نہیں استعمال کرتے' بلکہ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ شعر کے ظاہری حسن کے بجائے' خواجہ آتش کی طرح بندش کی چستی' اور داخلی سوز و گداز پر زیادہ توجہ دیتے ہیں' جس سے کہ شعر میں تغزل کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ذیل کے انتخابِ کلام سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آتش کے ممتاز تلامذہ میں رند۔ صبا۔ نسیم۔ کیف' خلیل اور آغا حجو شرف' نے' اپنے کلام میں سادگی' سلاست' روانی' اور برجستگی کو کس حد تک برتا ہے' اور کس حد تک شعر میں اندرونی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے' آتش کے ان تلامذہ کے دواوین میں بہ کثرت۔ اشعار اس کی شہادت دینے کے لیے موجود ہیں۔ ذیل میں صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جاسکتا ہے ؎

رندؔ

بس اب آپ تشریف لے جائیے — جو گزرے گی مجھ پہ گزر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز — ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

ہم جو کہتے ہیں سراسر ہے غلط — سب بجا ہے آپ جو فرمائیے

رکھو خدمت میں مجھ سے کام تو لو — بات کرتے نہیں، سلام تو لو
رندؔ حاضر ہیں شیشہ و ساغر — مے نہ سمجھو اگر حرام تو لو

ہجر میں تھی کسے امیدِ سحر — رات کاٹی خدا خدا کر کے
قدر میری تجھے نہ تھی صیادؔ — ہاتھ ملتا ہے کیوں رہا کر کے

باغباں دشمن ہے گلچیں برخلاف — آشیانہ باغ سے لے جائیے

کیوں گھٹائے عبث بڑھا کر ربط — کوئی ایسا بھی یار کرتا ہے

صباؔ

نہ کریں آپ وفا ہم کو کیا — بے وفا آپ ہی کہلائیے گا

جس کا مطلب صاف ہے اس بات کی کیا بات ہے
شعر وہ کہیے ادھر پڑھیے اُدھر مشہور ہو

مضمون پیچدار ہیں مگر وہ اے صباؔ — اشعار ہر زمین میں ہیں عاشقانہ فرض

ان کی رفتار سے دِل کا عجب احوال ہوا ۔۔۔ رُندھ گیا پس گیا مٹی ہوا پامال ہوا

بندے کے لیے جو آفتیں ہیں ۔۔۔ اے عشق تری کرامتیں ہیں
ظلمات کہاں کہاں رہِ عشق ۔۔۔ اے خضر بڑی مسافتیں ہیں
دو دن کی حیات پر فلک سے ۔۔۔ کیا کیا شکوے شکایتیں ہیں

کس یاس سے کہتا ہوں میں اُن سے دمِ رخصت ۔۔۔ لو جاؤ تم اللہ نگہدار تمہارا

نسیم

میں وہ بے آس ہوں کہ میرے پاس ۔۔۔ یاس آئی ہے آسرا کر کے

ساقی قدحِ شراب دے دے ۔۔۔ مہتاب میں آفتاب دے دے
ساقی باقی جو کچھ ہو لے لے ۔۔۔ باقی ساقی شراب دے دے

خُم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے ۔۔۔ مثلِ ساغر اور کے کام آئیے

آپ آہو چشم ہیں آہو نہیں ۔۔۔ ہم سے وحشت کی نہ لیجیے آئیے

خلیق

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو ۔۔۔ اٹھیے گھر جائیے دم لے چکے گستائے بہت

یار نے آ کے دمِ نزع کہا ۔۔۔ کیا ارادہ ہے کہاں جائیے گا
میرے دِل میں اگر آپ آئیے گا ۔۔۔ داغ کی طرح سے رہ جائیے گا

بہت تنگ آئے ہیں اب پیچ والے ۔۔۔ اِدھر آتے آتے اُدھر جاتے جاتے
وہ گھر میرے آ کر محبت سے بولے ۔۔۔ کہاں راہ بھولے کدھر جاتے جاتے

کیفؔ

شوق ہوتا جو راہبر اپنا | یار ملتا جدھر گئے ہوتے
قہر تھا وہ جو وعدۂ دیدار | حشر کو بھی مکر گئے ہوتے
چھوٹ جاتے جو قیدِ ہستی سے | کیا کہیں ہم کدھر گئے ہوتے

دل بھی کھویا عاشقی میں مال بھی | جائے عبرت ہے ہمارا حال بھی

فرقت میں رہا یہ حال شب بھر | جیسے کوئی جان توڑتا ہو

جاتے ہیں وہ پاس سے ہمارے | اب دیکھیے کوئی دم میں کیا ہو

شرفؔ

ٹھہرا گیا ہے لا کے جو منزل میں عشق کی | کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا کون تھا
کیا ہنستے ہو تم کو مری فریاد سے کیا کام | آباد رہو تم تمھیں ناشاد سے کیا کام
دم بھر میں تری بزم سے اٹھ جائیں گے مر کے | فانی ہیں ہمیں اس ابد آباد سے کیا کام
اے ہم نفسو خوش ہو رہائی ہو مبارک | کیوں کڑھتے ہو تم کو مری میعاد سے کیا کام
اے جانِ جہاں میتِ عاشق کو نہ پوچھو | آزاد کیا جس کو اس آزاد سے کیا کام

تصوف خواجہ آتشؔ کی طرح ان کے تلامذہ نے بھی، تصوف و اخلاق، اور استغناء و بے نیازی کے مضامین کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ وہ شاگردانِ ناسخؔ کی طرح صرف خیال بندی، مضمون آفرینی، اور شعر کے ظاہری حسن میں ہی نہیں الجھے، بلکہ اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے اپنے کلام میں تصوف و اخلاق جیسے موثر مضامین کو سمونے کی طرف پوری توجہ کی، جس نے ان کے کلام کو اور جلا دی۔ اس رنگ میں تلامذہ آتشؔ کا کلام ملاحظہ ہو۔

رنؔد

صبا کی طرح دیر و کعبہ میں جس کا میں جویا تھا
برنگِ بوئے گل دیکھا تو وہ مجھ میں ہی پنہاں تھا

جلوہ تیرا اے صنم ہر سو نظر آیا مجھے
جس طرف کو میں نے دیکھا تو نظر آیا مجھے

غور سے جس شے کو دیکھا تو نظر آیا مجھے
تو ہر اک گل میں برنگِ بو نظر آیا مجھے

لگا یا کرتے ہیں مجذوب کی طرح سے بڑ
سنا ہے رند بھی درویش باکمال ہوئے

ہے حقیقت مجاز سے مطلوب
بت پرستی خدا پرستی ہے

سنا ہے نام فقط پر نشاں نہیں معلوم
بتا میں کیا دوں مجھے خود مکاں نہیں معلوم

صبؔا

اٹھ گیا دیدہ و دل سے جو دوئی کا پردہ
ایک ہی نور ہوا ارض و سما سے پیدا

نشان بھی نہ رہے گا مزار کا اپنے
ترا ہی نام بس اے کردگار باقی ہے

کہتی ہے روح جانب افلاک دیکھ کر
اس ہفت خواں سے ہے گزر رستانہ فرض

سیر کے واسطے ہو اور ہی عالم پیدا
کیا تماشا ہو جو دل سے یہ جہاں دور رہے

سجدے ہو جاتے ہیں کچا او غافل
کون معبود ہے کیا ہونا ہے

نسیمؔ

کیا کریں اصرار کچھ اسرار بھی کھلتا نہیں   سیکڑوں یاں سے گئے اور واں سے آئے سیکڑوں

جلوہ حرم و دیر میں ہے یار تمہارا   دم بھرتے ہیں سب کافر و دیں دار تمہارا

شانہ جو بنایا دلِ صد چاک کا ہم نے   کیا سر پہ چڑھا طرّۂ طرّار تمہارا

خواہ کعبہ خواہ بت خانہ کو جا   دشتِ دل کا رہ گزر ہے دو طرف
دل بدل آئینہ ہے دیر و حرم   حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف

بلند مرتبہ اپنا ہے چشمِ تر کے سبب   زمیں سے ابر کے مانند آسماں پہ چڑھے

کیفؔ

کھل جائیں دلِ کیف پہ گر معنی توحید   مطلع سے ہو مقطع تلک اک رنگ غزل کا

بڑھیں گے جو عشقِ مجازی سے آگے   حقیقت میں کیا ہوگا نقشہ ہمارا

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا   تمہارے واسطے کی ہے کہاں کہاں فریاد

ہم وہ صوفی ہیں اگر ٹوٹیں ظروفِ بادہ   حالتِ وجد ہو شیشے کی صدا سے پیدا

دلِ خاک میں ملا کہ خدا کو پسند ہے   زیرِ قدم ہے عرش جو ہمت بلند ہے

خلیلؔ

دیکھیں کیوں کر آدمِ خاکی تجھے   چشم تصویرِ گِلی کی کور ہے۔

دل ہی میں نہیں کچھ ترا جلوہ تو ہر اک کو — شمعِ حرم و دیر و کلیسا نظر آیا۔
وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے — جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا

شرف

موجد جو نور کا ہے وہ میرا چراغ ہے — پروانہ ہوں میں انجمنِ کائنات کا
اس بے خودی کا دیں گے خدا کو وہ کیا جواب — بھرتے ہیں دم جو چند نفس کی حیات کا
آئے تو آئے عالمِ ارواح سے وہاں — دم بھر جہاں نہیں ہے بھروسا ثبات کا

رہے گی غنچہ میں رنگت نہ گل میں بو باقی — یہ سب تجھی پہ مٹیں گے رہے گا تو باقی

منتہی

ہر رنگ میں ہے جلوۂ جانانہ آشکار — پردا نہیں رہا ہے ذرا اشتباہ کا

دل میں ایک نور کا جلوہ دیکھا — بند اس قطرے میں دریا دیکھا

اٹھا دیدۂ دل سے پردا دوئی کا — سمجھ ایک دیر و حرم کی حقیقت

دل میں نیرنگ تمھارا دیکھا — جزو میں کُل کا تماشا دیکھا

عالم ہے بے ثبات اے دل — اک ذات کو ہے ثبات اس کی

طلا مکدے میں نہ دیر و حرم میں — کہیں یار ترا ٹھکانا نہ پایا

ہر اک شے میں ہے جلوہ گر اس کا جلوہ — اُسی کی قسم اس کو ہم جانتے ہیں

دِل کی صفا کو خواہشِ دنیا نے کھو دیا	تر دامنی نے جامۂ تن کو ڈبو دیا۔

فقیری و درویشی کے مضامین

گذشتہ باب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خواجہ آتشؔ نے اپنے کلام میں فقر و فنا اور قلندری و درویشی کے مضامین کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ باندھا ہے ان کے شاگردوں نے بھی اپنے استاد کے اس وصف کو شاعری کا ایک اہم جزو سمجھتے ہوئے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا، اور اپنے کلام میں اسے خاص جگہ بھی دی۔ شاگردانِ آتشؔ کے دواوین میں ان مضامین کے بکثرت اشعار بھی موجود ہیں، مگر ان میں خواجہ آتشؔ جیسی فقیرانہ شان، اور قلندرانہ ادائیں کہاں، پھر بھی ان اشعار میں جو زندگی پائی جاتی ہے، وہ ان کے معاصر شعرا میں مفقود ہے، اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رندؔ

رہا وزیر سے مطلب نہ بادشاہ سے کام	چھڑایا فقر نے اِک اِک کی التجا سے غرض

امارت کا مزا یاں فقر کی دولت سے حاصل ہے	اٹھایا بوریے پر چین پھولوں کے چھپر کھٹ کا

اس بوریائے فقر کی توقیر دیکھنا	جھک کر سلام کرتے ہیں مسند نشیں تجھے

گر کلاہِ فقر سے تو آشنا ہو جائے گا	بال سر پر طرۂ بالِ ہما ہو جائے گا

بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اُس دن سے	ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

خود آئے کچھ غرض ہو اگر بادشاہ کو	اٹھے گا یہ فقیر نہ اپنے مقام سے

شامیانہ منعموں کو چاہیے | ہم بسر کر لیں گے کمبل تان کر

خاکساروں ہی نے ہے عشق کی دولت پائی | انھیں ویرانوں میں یہ گنجِ نہاں رہتا ہے

فقیرانہ معبود کی ہے عبادت | یہی بوریا ہے مصلیٰ ہمارا

طاقتِ فقر سے ہم نفس پہ غالب آئے | لنگر اس دشمنِ شہ زور کا توڑا کیا کیا

مسند کیسی فقیر ہوں میں | تھوڑی سی جگہ ہو بوریا ہو

کبھی بھولے سے بھی ٹھوکر نہ ماریں تاجِ شاہی کو | یہ مستغنی کیا ہے ہم فقیروں کو توکّل نے

کیفؔ

کرے کمال قناعت اگر بشر حاصل | تمام عمر فقیری میں بادشاہ رہے

خاکساری کیوں نہ ہو اپنا طریق | ایک دن جانا ہے نیچے خاک کے

ہے بستر فقیر کا ایسے مکان میں | دیوار کی نہ اوٹ جہاں ہے نہ در کی آڑ

کمبل کو دیکھ دیکھ کے اپنے ڈرا کیا | چھایا یہ مجھ فقیر پہ ظلِّ ہما کا خوف

مضطرب وہ ہوں جو درویشی کروں میں اختیار | حالتِ امواج نقشِ بوریا پیدا کرے

بنے گا گلشنِ جنت فقیر کا شجرہ | ہوا اگر اثرِ نقشِ بوریا دریافت

خلیل

حباب کرتے ہیں یہ اشارے زِ فکرِ تعمیر کیجیو یاں
کہ حبس کرنا پڑے گا دم کو بڑی خرابی ہے گھر بنا کر

بادشاہوں کا بھی مٹ جاتا ہے نام
بے نشاں بہرام کی بھی گور ہے

اس کی تعریف کیا کرے کوئی
ہر صفت جس کی عین ذات ہوئی

منتہی

گلیم فقر اگر منتہیؔ کے ہاتھ آئے
تمھیں کہو کہ وہ لے کر دو شالہ کیا کرتا

نشاں جب سے کوئے قناعت میں گاڑا
گری دل سے جاہ و حشم کی حقیقت

آج میں بیٹھا ہوں کل بیٹھے گا کوئی اور یار
یوں ہی بچھا بوریا اس فقر کا رہ جائے گا

رندی و سرمستی رندی و سرمستی کے مضامین بھی خواجہ آتشؔ نے بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ ان کے تلامذہ نے بھی اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے رندانہ مضامین کو بہتر سے بہتر پیرایہ میں باندھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بیشتر اشعار کیف و نشاط میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذیل کے انتخاب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تلامذہ آتشؔ اپنے استاد کے اِس رنگ میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں ؎

رندؔ

وہ بادہ نوش ہوں جاتا تھا جب دبستاں میں
بغل میں رہتی تھی بوتل کتاب کے بدلے

مریدِ پیرِ مغاں ہوں مری وصیت ہے
مجھے شراب سے دیں غسل آب کے بدلے

پلا دے بادہ کشوں کو اٹھا نہ رکھ ساقی صراحی میں کئی ساغر شراب باقی ہے

ساقیا جھوم کے بدلی جو کبھی آتی ہے حسرتِ ساغرِ صہبا و سبو آتی ہے
سالِ آئندہ تلک زیست اگر ہے باقی مے کشو فصلِ مے و جام و سبو آتی ہے

ابھی تو خوب برستے ہیں میکدوں پہ سحاب چڑھاؤ جام ہوائے شراب باقی ہے

فصلِ گل ہے کو بہ کو چلّا رہے ہیں مے فروش بادۂ رنگیں بیادِ ساقیِ کوثر بنوش

بہ رنگِ فصلِ گل مہماں ہے موسم جوانی کا پلا ساقی کوئی ساغر شرابِ ارغوانی کا

وہ پری شیشے میں اتاری رندؔ جو سلیماں تک کبھو نہ گئی

صباؔ

بہار آئے الٰہی چمن ہری ہو جائے یہ زرد زرد ہر اک شے ہری ہری ہو جائے

لائیے بلوائیے جامِ شراب دیکھیے بدلی وہ آئی دیکھیے

شراب چل کے شبِ ماہ میں پئیں ہم تم چمن کی سیر کبھی اے قمر نہیں ہوتی

ہم مے پرست فوق نہ دیں گے شراب پر زردشت لاکھ وصف کرے آفتاب کے

وہ مست ہیں ادھر تو رکھتے نہیں ہیں ساغر
مغرب سے ہاں نمایاں جب آفتاب ہو گا

دم بدم ساقی و مطرب کو سزا دیتے ہیں
موسمِ گل میں ہم ایک دھوم مچا دیتے ہیں

پھر بہار آئی الٰہی پھر جنوں کا جوش ہو
پھر گلے میں طوق ہو پھر پاؤں میں لنگر پڑے

اول مے الست ہے آخر مے طہور
کتنا صفا ہے مشربِ پیرِ مغاں تمام

نسیم

لگا جامِ شرابِ عشق جب منہ سے خرابی ہے
نشہ آغاز ہوتا ہے خمار انجام ہوتا ہے

قلقل سنا کے چھیڑتے ہیں مے پرست کو
شیشہ سرود یاد دلاتے ہیں مست کو

الٰہی موت بھی آئے تو بزمِ رنداں میں
کہ ہنستے ہنستے میں جامِ شراب سا چلتا

آئی بہار زاہد ہشیار مست ہو
شیشے کی فتح توبۂ مے کی شکست ہو

صہبا کشوں کی خاک ہے ہر اک مقام پر
ساقی لنڈھا شراب کو مستوں کے نام پر

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

کیف

مے لنڈھاتے ہیں قدح کش کہیں میخانوں میں
آتی ہے قلقلِ مینا کی صدا کانوں میں

رہی پروا نہ ساقی کی نہ شیشے کی نہ ساغر کی
تصور آ گیا جس دم کسی کی چشمِ میگوں کا

ساقی فقیر دوست ہے پیرِ مغاں سخی
بھر دے گا کوئی تو مرے جامِ سفال کو

ہمیں خم میں چھپا دینا جو آئے محتسب ساقی تجھے بتلائے دیتے ہیں یہ نسخہ ہم فلاطوں کا

بادہ خواری یا وصالِ یار یا سیرِ بہار اس سوا ہم کو نہیں کچھ کاروبار اب کے برس

ہجرِ ساقی میں جو اے کیفؔ کروں بادہ کشی شورِ ماتم کا ہو قلقل کی صدا سے پیدا

کریں پریوں کی صورت جام و مینا رقص شادی سے
جو نسبت کیفؔ کی بنت العنب سے ساقیا ٹھہرے

منتہیٰ

گل کھلے ہر سو لبالب جام ہے دور دورِ رندیٔ آشام ہے

قلقلۂ شیشۂ مے زمزمۂ مرغِ چمن یار ساقی تھا تجھے یاد ہے کیفیتِ صبح

جامِ مے سے آنکھ برسوں ہی لڑی ہے ہمارا دیکھا بھالا آفتاب

چمن میں بلبل یہی پکاری لو میکشوں کی پھر آئی باری
زباں پہ شیشے کے ہے یہ جاری شراب لو یاں ڈھلک رہی ہے

اس سے روشن دل ہوں اس سے روئے خلق جامِ مے کے سامنے کیا آفتاب

عشقیہ مضامین خواجہ آتشؔ کی طرح ان کے شاگردوں نے بھی شعر کے داخلی حسن پر خاص توجہ کی۔ گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کے سطحی اور خارجی مضامین کو ترک کر کے، واردات قلبیہ اور سوز و گداز کو شعر کا ایک اہم

جز قرار دیا، جس کے نتیجے میں ان کا بیشتر کلام مبالغہ آرائی، معاملہ بندی اور سطحی مضامین سے پاک ہی نہیں ہوا، بلکہ اندازِ بیان میں بھی ایک خاص قسم کا کیف و اثر پیدا ہوگیا۔ نمونے کے لیے ذیل کا انتخاب ملاحظہ ہو:

رندؔ

کس شب ہمیں تصوّرِ زلفِ سیہ نہ تھا　　کس دن ہماری جان پہ نازل بلا نہ تھی

کب نہ ششدر ہوا گلی میں تری　　کب نظر میری چار سو نہ گئی

عدم کو چلاکے داغِ محبّت　　دکھاؤں گا سب کو نشانی تمھاری

محبت عناصر میں شامل ہوئی　　لہو بن کے رگ رگ میں داخل ہوئی

او کماں دار میرے سینے سے سب تیر نکال　　دل میں جو ڈوب گئی ہے وہ سری رہنے دے

تلاطم سے محیطِ عشق کے عاشق کو کیا ڈر ہے　　نہیں کچھ نوح کی کشتی کو خوفِ غرق طوفاں میں

شاہد القول ہمارا ہے دماغِ یعقوب　　سیکڑوں کوس سے معشوق کی بو آتی ہے

صباؔ

اللہ ہمیں عشق کے پھندے سے نکالے　　دم توڑتے ہیں قطعِ محبت نہیں ہوتی

آتشِ عشق نے اک آگ لگا رکھی ہے　　دل جدا جلتا ہے اور روح جدا جلتی ہے

عاشق ہوں میں بیتابیِ دل کام ہے میرا　　جب تک نہ میں تڑپوں مجھے آرام نہیں ہے

سیماب دارِ عشق میں ہم بے قرار ہیں — قابو میں روح ہے دلِ پُر اضطراب کے

لباسِ عشق نکلا جامۂ حسن — اٹھا جس وقت پردا درمیاں سے

نسیمؔ

پیری میں طرزِ عشقِ جوانی وہی رہا — صورت کے ساتھ دل کا بدلنا محال تھا

عشق کے رتبے کے آگے آسماں بھی پست ہے — سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

قلزمِ عشق ایک طوفاں خیز ہے — ڈوبے اس دریا میں صدہا آشنا

منتہیؔ

عشقِ کامل نہیں جائے گا مرا تا دمِ مرگ — یہ وہ دریا ہے چڑھا جب کہ اترتا ہی نہیں

دیوانگانِ عشق کے خاطر ہے جائے دشت — پیدا کیا ہے ان کو خدا نے برائے دشت

عشق تو شایانِ دل ہے عشق کو دل چاہیے — مے تو قابل منہ کے ہے منہ مے کے قابل چاہیے

فصلِ گل میں اس طرح کا ہو گیا سودا مجھے — دیکھتا ہوں صورتِ گل گاہ گلہے روئے دوست

عہدِ طفلی سے ہوں فدائے صنم — میرا بچپن کا آشنا ہے عشق

شیفتہ ہوتا ہے زلفِ بتِ ہرجائی کا — دل کو سودا سرِ بازار ہوا چاہتا ہے

کیفؔ

کیا کہیے جو کچھ سوزِ محبت میں مزا ہے — گل کھاتے ہیں پر سیر طبیعت نہیں ہوتی

پھاڑیں دامن کہ جیب چاک کریں ہر طرح سے مجاز ہیں ہم لوگ

بعد مردن بھی رہی ایسی حرارت عشق کی دیر تک احباب آ آ کر بدن دیکھا کیے

خلیلؔ

کرتے ہیں پیرہن کو مرے تار تار ہاتھ ہو جاتے ہیں بہار میں بے اختیار ہاتھ

تم سنو یا نہ سنو نالے کیے جاؤں گا دردِ دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو

جنوں میں بھی یہی دھن ہے کوئی ادھر سے جائے جدھر وہ دشمنِ ہوش و حواس رہتا ہے

بے خودی بھی عجیب عالم تھا دن نہ اس میں ہوا نہ رات ہوئی

ہاتھ پورا نہ پڑا زخم لگائے اوچھے قتل کرنا بھی نہ تجھ کو مرے جلاد آیا

شرفؔ

جدھر نگاہ گئی آئی تیری شکل نظر یہ ذوق و شوق بڑھا عشقِ یار کے باعث
ہمیشہ گرد آلودہ ہی رکھا عشق بازوں کو نہ اپنے ذرّوں کو اس نیّرِ اعظم نے پہچانا
جس میں تری ہوس ہے اس دل کو ڈھونڈتے ہیں
لیلیٰ سمیت ہم تو محمل کو ڈھونڈتے ہیں

عشق بازی کا مزہ لوٹیے کابل ہو کر چاہیے یار کو اپنے ہمہ تن دل ہو کر

ہندی و بھاکھا الفاظ کا استعمال

تلامذہ آتشؔ نے، اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے، اپنے کلام میں ہندی و بھاکھا کے

الفاظ کافی تعداد میں استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے ہندی کے آسان، عام فہم، اور رائج الوقت الفاظ استعمال کر کے زبان کے دائرہ کو وسعت بخشی ہے۔ عامیانہ اور بازاری الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ ذیل کے انتخاب میں کلنک، ٹیکا، روگ، جھنوں، رتن، پارس جیسے الفاظ حسن و خوبی کے ساتھ باندھے گئے ہیں، جس سے شعر میں ہندوستانیت جھلکتی ہے ؎

رندؔ

شاید کیا کسی رخِ انور سے سامنا ٹیکا کلنک کا ہے یہ داغِ قمر نہیں

سنبھالو آپ کو اے رندؔ ترک عشق کرو کہاں کا روگ لگایا ہے جانِ مضطر کو

ہمیں یہ نہ تھی تم سے چشمِ امید کہ دو دن میں جھنوں بدل جائے گی

شگاف کر دیا سینے کو نوکِ خنجر سے کواڑ چھاتی کے کھولے ذرا ہوا آئی

سودائیوں کی بیڑیاں سونے کی ہو گئیں پارس ہے کیا گلی کی ترے سنگ وخشت میں

اگر وہ ماہ پیکر اس میں جھولے ہنڈولے میں ہو گردش آسماں کی

صباؔ

صباؔ کے داغِ جگر نے یہ گل کھلایا ہے کہ بن گیا ہے کٹورا گلاب کا پھاہا

سرِ محفل بٹھا کر چاہنے والوں کو رلوایا نیا گانا نکالا آپ نے بے تال و بے سُر کا

کیوں دیکھ کے غیروں کی طرف بھاؤ بتایا یہ بھی ہے کوئی ادبِ بے شرم و حیا رقص

جب اٹھا ابر وہ ساقی کا کرم یاد آیا ہائے روتے مجھے گزرا ہے یہ ساون کیسا

قیدِ مذہب واقعی اک روگ ہے آدمی کو چاہیے آزاد ہو

اس بت کا کوچہ کعبہ ہو یا سومنات ہو جب اپنی مستجاب دعا ہو تو جانیے

شوقؔ

یہی بتلانے کو تھا میں کبھی گھات چھین لی گویا میرے منھ کی بات

کیا اثر ہے زبان کو تیری سب کلپتے ہیں جان کو تیری

گر مچلکا نہ اس کا دن بجے آپ اپنی رادھا کو یاد کیجیے آپ

شرم سے گو کہ غرق تھا تن میں پر شرارت بھری تھی چتون میں

نسیمؔ

اشارے میں ادا ہوتا ہے حقِ مدعا گوئی بیانِ بے بیاں چتون زبانِ بے بیاں ابرو

چاہ اپنی مانتا نہیں وہ بے یقیں اگر قرآں کا جامہ پہنیے گنگا اٹھائیے

حسین ہو رنگ ہو روغن ہو لیکن آنکھوں میں حیا نہ ہوئے تو چکنا گھڑا ہے پنگھٹ کا

عشق بن دل، دل بنا تو جان لیں تیل بن بتی، بنا بتی دیا

کیفؔ

مرحوموں کے واسطے ہے یہ ٹیکا کلنک کا گھونگھٹ ہو عورتوں کا جوں میں سپر کی آڑ

اے بت خدا گواہ ہے وہ بت شکن ہے تو   جس بت کرے میں جائے وہاں رام رام ہو

روشن یہی ہوتا ہے کمر دیکھ کے ان کی   یہ بال متقرر ہے مرے دل کے کنول کا

گہہ تخت نشین ہے کوئی گہہ خاک نشیں ہے   ایک سوانگ فلک کو ہے اسی پھیر بدل کا

لگی ہے چوٹ جس کو عشق کی دل اس کا دکھتا ہے
مرے نالے نہ ٹھہرے یہ کوئی پھوڑا ہوا ٹھہری

حسن و عشق میں پردہ ہے فقط دیکھنے کا   کہیں آئینے کی ٹٹی نہ وہ دلبر رو کے

منتہی

پیری آئی شباب چل نکلا   چیت کس نیند یار سوتا ہے

گیسوئے صنم سے دل لڑا ہے   ہے سامنا آج کس بلی کا

بہار حسن ہے کرتے ہیں چھیے عاشق   چمن پہ روپ ہوا شور ہے عنادل کا

دم دے کے نہ نقد دل کو لے لے   چل جائے کہیں نہ گھات اس کی

دیکھو بتان ہند یہ شیدا ہے دل مرا   مسجد بنی ہے خواب شوالوں کے سامنے

شرف

انکھڑیوں سے تری تشبیہ ہیں دن دور از حال
روگ ہے نرگس گلزار کو بیماری کا

ہمارا حال جنوں خیز ہے شریک اس میں — بگولے اڑتے ہیں اپنے غبار کے باعث

کبوترے دیتے ہیں غنچے بڑا ہے سناٹا — چہل پہل تھی چمن میں ہزار کے باعث

محاورات کی فصاحت ولطافت

شاگردانِ آتشؔ کے یہاں روزمرہ اور محاورات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ یہ محاورات اصولِ فصاحت سے جانچنے اور پرکھنے کے بعد استعمال کیے گئے ہیں۔ خاص کر شوقؔ لکھنوی اور نسیمؔ لکھنوی کے کلام میں محاورات اور روزمرہ کا جو اہم ذخیرہ محفوظ ہے، اس کی مثال دبستانِ لکھنؤ میں ملنا مشکل ہے۔ ذیل کے انتخابِ کلام میں تلامذہ آتشؔ کے یہاں محاورات کی لطافت ملاحظہ ہو ؎

رندؔ

عشقِ افشانِ جبینِ یار میں — خاک چھلنی کی طرح چھانا کیا

دھو کے دریا میں کبھو کا سے ہاتھ — آگ پانی میں لگایا نہ کرو

آمد آمد ہے کس کی گلشن میں — گل جو پھولے نہیں سماتے ہیں

چھلّے دیتے ہیں کہتے ہیں گل کھا — گرمیاں کرتے ہیں جلاتے ہیں

یاں لحد میں ہے فرشتوں سے سوال اور جواب — جھوٹ سچ باتیں وہ گھر بیٹھے بناتے ہی رہے

صباؔ

لہو کیا کیا رلایا آرزوئے قتل نے مجھ کو — جگر خوں کر دیا قاتل تری تیغِ تغافل نے

صبا بیٹھو رہا تھ پر ہاتھ دھر کر کوئی کام تجھ سے سنورتا نہیں ہے

رنگ لایا ہے انتظار ان کا آنکھ کا تل سفید زیرہ ہے

خاک اڑاتا جو مرے دشتِ جنوں میں مجنوں ہر بگولے سے عیاں ناقۂ لیلیٰ ہوتا

خوب ہی اس گل کو لائے راہ پر اے صبا تم بھی بڑے استاد ہو

دشتِ وحشت میں پھرا ہوں میں بگولا ہو کر خاک چھانی ہے بہت بادیہ پیما ہو کر

شوق

دل جو صدمہ بڑا اٹھاتا تھا ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا

غم نے کی دل سے کچھ ادائی سی منہ پہ چھٹنے لگی ہوائی سی

دیکھ کر دونوں عارضِ پرنور رنگ چہرے سے ہو گیا کافور

کیا فریب آپ سے کیا میں نے کون سا تم کو جل دیا میں نے

کیسے کیسے کنوئیں جھکائے گی سیکڑوں لاکھوں فیل لائے گی

نسیم

بلبل کے منھ سے اڑنے لگی ہیں ہوائیاں صیاد کو بتا کہیں او باغباں ہوا

اس آگ پر سپند کی صورت ہے دل مرا رکھتے ہیں پھونک پھونک قدم کو جہاں ہوا

شیخ گورندوں میں آ باتیں بنائیں سیکڑوں ایسے چڑیا کے تو ہیں ہم نے اڑائے سیکڑوں

چمن میں گل نے کہیں دعوئ جمال کیا جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

کیف

ان ضعیفوں سے کوئی پوچھے خدا کے واسطے جس پہ تکیہ تھا جوانی میں وہ طاقت کیا ہوئی

حلقِ ذبیح حلقۂ فتراک بن گیا لائے ہیں رنگ آپ کے نخچیر دیکھیے

نالے کروں جو میں تو عجب انقلاب ہو اک دم میں آسمان کی مٹی خراب ہو

کیا کہیے جو کچھ سوزِ محبت میں مزا ہے گل کھاتے ہیں پر سیر طبیعت نہیں ہوتی

یار کے تیرِ نظر سے ہم اگر بچ جائیں گے آنکھیں دکھلا کر کہیں گے کیوں مروّت کیا ہوئی

منتہی

غازہ ملا ہے مہندی لگائی ہے یار نے کیا گل کھلائے ہیں چمنِ روزگار نے

اڑ گئے مرغِ چمن سب گل کنارا کر گئے جان کے لالے پڑے ہیں ان دنوں صیّاد کو

جز میرے دال آپ کی گلتی نہیں کہیں یوں منہ سے جتنی چاہیے شیخی بگھاریے

تمثیل نگاری خواجہ آتش کی طرح ان کے تلامذہ کے یہاں بھی تمثیلی شاعری کے نمونے بہ کثرت نظر آتے ہیں۔ ذیل کے انتخاب سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

رندؔ

ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے

رات کو گھر سے وہ کس طرح برآمد ہوتے
شب کو نکلا ہے کہیں مہرِ منور باہر

کشتِ انجم کو نہ سرسبز کرے ابرِ بہار
کام اسفل سے نہ اعلیٰ کا نکلتا دیکھا

جو اعلیٰ ہیں مقام ان کا ہوا اسفل غیر ممکن ہے
بھڑکتی طور کی آتش نہ دیکھی ہم نے مجمر میں

نکلے نہ کبھی دردِ جگر بے مددِ آہ
بھرتا ہے دھواں گھر میں جو ہوتی ہے ہوا بند

صباؔ

فیضِ صحبت سے بزرگوں کے ہے خردوں کو فروغ
قطرہ بنتا ہے گہر داصلِ دریا ہو کر

نہ کس طرح سے ہو پیری میں داغِ دل معدوم
آخر ماہ کہاں ماہتاب رہتا ہے

نہ دیکھا کسی ہم نے طامع کو شاکر
کبھی پیٹ ظالم کا بھرتا نہیں ہے

رکھے ظرف کیا کوئی کم مایہ ہو کر
حباب آب دریں؟ ابھرتا نہیں ہے

نسیمؔ

نسیمؔ اس چشمِ دل سے کچھ نہ ٹھہری صورتِ مطلب
نہ ٹھہرا نقش پانی پر نہ سیماب آگ پر ٹھہرا

خوبوں کو محبت ہے بڑوں سے بھی کہ چوں گل
رہتا ہے سدا سایہ فگن خار کے اوپر

بڑھ کے فوارے کے مانند نہ بول اے منعم
تھوکنا چرخ کو ہے اپنے ہی آتا منھ پر

رخنہ اندازی کی کب چھٹتی ہے آنکھ　　چشمِ روزن کی نظر ہے دو طرف

بلند مرتبہ اپنا ہے چشمِ تر کے سبب　　زمیں سے ابر کے مانند آسماں پہ چڑھے

خلیل

دل سوختوں کو رزق سے سیری محال ہے　　بھرتا نہیں ہے پیٹ غذا سے تنور کا

ٹھہرے خیال کیا دلِ سوزاں میں یار کا　　ہوتا نہیں ہے دخل جہنم میں حور کا

منتہی

آتش سے ہجر کی دلِ مضطر ہے بے قرار　　سیماب آگ پر نہ کبھی مستقل ہوا

زوالِ حسنِ صنم آیا منڈ گئی کاکل　　وہاں نہ مار رہا صَرف جب خزانہ ہوا

اشکِ پرتاثیر کو کیوں کر نہ رکھوں میں عزیز　　دوست تر رکھتا ہے انساں طفلِ برخوردار کو

ہے حبابِ لبِ دریا انساں　　جب ذرا سر کو اٹھایا بیٹھا

کیف

کیوں کر نہ دل سیاہ کرے عشقِ زلفِ یار　　ہوتا ہے رفتہ رفتہ دھوئیں سے مکاں خراب

رنج دے دے کے جو پیٹے ہے زمانہ کیا دور　　کاٹ کر سانپ سنا ہے کہ الٹ جاتا ہے

کیفؔ اس بت کو کرے آہ مری کیا تاثیر　　تیر پتھر پہ جو پڑتا ہے اوچٹ جاتا ہے

نہ کس طرح سے وہ مہ چاندنی میں یاد آئے　　چکور اڑتے ہوئے سوئے ماہتاب چلے

عاشق کے دیکھنے میں ہے وصفِ نگاہ کیا　　　　لینے نہیں ہیں نام چھری کا شکار میں

آغا حجو شرف اور ان کا اقدام یہاں تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس حقیقت کے پیش نظر لکھا گیا ہے کہ خواجہ آتش کے شاگرد اپنے استاد کے نظریۂ شاعری سے کہاں تک متاثر ہوئے اور ان کے رنگِ سخن کو کس طرح اپنایا۔ اس مطالعے کے دوران حقیقت یہ بھی بے نقاب ہو کر سامنے آئی کہ تلامذہ آتش میں آغا حجو شرف نے اپنے استاد کی پیروی پر اکتفا نہیں کی اور نہ صرف ان کے رنگ کو اپنانے پر زور دیا بلکہ انھوں نے پوری ہمت کے ساتھ ان تمام علائم اور متداول الفاظ (جیسے زاہد، واعظ، بت خانہ، ناقوس، پیر مغاں، شیخ، ساقی، ساغر، کلیسا وغیرہ) کو جو لکھنؤ کے مزاج شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے اور رندی و ہوس ناکی کے مظہر تھے ان کو متروک قرار دیا اور ان کو استعمال کرنے سے پرہیز کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرف کا دیوان ایرانی اثرات سے بالکل پاک ہو گیا اور اس میں ہندوستانیت آگئی۔ اگرچہ ان کا یہ اقدام مقبول نہ ہو سکا پھر بھی ان کا یہ اقدام اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاگردانِ آتش کس حد تک اپنے کلام میں خارجی مضامین کے بجائے داخلی رنگ اور سنجیدگی و متانت پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

باب ششم

لکھنؤ کی شاعری پر تلامذہ آتش کے اثرات

پچھلے باب میں تلامذہ آتش کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خواجہ آتش کے ان تلامذہ نے اپنے ہمعصر شعرا کو شعوری یا غیر شعوری طور پر کس حد تک متاثر کیا ہے۔

لکھنؤ کی شاعری عام طور پر قافیہ پیمائی، لفظی صناعی، ضلع جگت اور تصنع سے بھری ہوئی تھی۔ مگر خواجہ آتش نے اپنے انفرادی رنگ کے ساتھ، شاعری کو ایک نیا روپ عطا کر دیا تھا۔ جب تلامذہ آتش نے اپنے استاد کے رنگِ شاعری کو آگے بڑھانے کی تحریک شروع کی تو عام طور پر لوگوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ شاعری صرف لفظی صناعی، قافیہ پیمائی اور تصنع ہی کا نام نہیں ہے بلکہ جذبات کی بے ساختگی، زبان و بیان کی سادگی اور شعریت ہی وہ عناصر ہیں، جو شعر کو پُراثر بناتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اہل نظر اس رنگ شاعری کی طرف متوجہ ہونے لگے، اور تلامذہ آتش کا یہ اثر تیزی کے ساتھ ہمعصر شعرا پر پڑنے لگا، اور کچھ مدت ہی میں تلامذہ آتش کے رنگِ شاعری کے اثرات، ہمعصر شعرا میں نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ ان اثرات کا جائزہ لینے کے لیے اس دور کے نامور شعرا کے کلام کا جائزہ ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ معاصر شعرا کون ہیں تو یہ بات ارباب نظر سے پوشیدہ

نہیں کہ تلامذہ آتش نے سب سے زیادہ شیخ ناسخ کے شاگردوں کو متاثر کیا اور ان میں میر علی اوسط رشک، خواجہ وزیر علی وزیرؔ، امداد علی بحرؔ خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں، سچائی یہ ہے کہ لکھنؤ کے دبستان شاعری اور دہلوی شعرا کو خواجہ آتش اور تلامذہ آتش نے متاثر کیا۔ ان کے اثرات امیر مینائی، جلال لکھنوی اور مشہور مرثیہ گو میر انیسؔ پر پڑے۔ حد یہ ہے کہ ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، یہ موضوع انتہائی وسیع موضوع ہے، سر دست میں "دبستان لکھنؤ" کے دائرہ میں رہتے ہوئے چند شعرا پر بحث کروں گا اور سب سے پہلے ناسخ کے کلام پر اسی اصول کے تحت تنقیدی نظر ڈالوں گا جن میں تلامذہ میر علی اوسط رشک کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

میر علی اوسط رشک وفات ۱۸۶۸ء

میر علی اوسط رشک شیخ ناسخ کے ان نامور شاگردوں میں تھے کہ جن کی نظر ہمیشہ صحت زبان اور تحقیق لغات پر رہتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اصلاح زبان کے مسئلہ میں ان کو اپنے استاد پر بھی فوقیت حاصل تھی۔ رشک کی تمامتر توجہ ظاہری حسن، نازک خیالی اور الفاظ کی صنعت گری پر مرکوز رہی۔ ان کا بیشتر کلام خالص لکھنوی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام میں قلبی واردات و کیفیات کے مؤثر بیان کی جستجو کرنا بیکار ہے۔

رشک کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے سے ہمیں شیخ ناسخ کے رنگ سخن کے برعکس کہیں کہیں زبان و بیان کی سلاست بھی نظر آتی ہے اور عصری اثرات بھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ رنگ سخن انھوں نے کس سے مستعار لیا؟ ظاہر ہے کہ ان کے معاصر شعرا میں خواجہ آتش اور ان کے تلامذہ کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا کہ جس میں یہ صفات بدرجہ اتم موجود ہوں۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رشک کا یہ کلام ناسخ کے مجوزہ اصولوں سے یا خود ان کے انفرادی رنگ سے کتنا مختلف ہے اور کس قدر سلاست و سادگی کا آئینہ دار ہے۔

اک بتِ بدگماں سے ملنے پر ۔۔۔ سارے عالم کی بدگمانی ہے

شبِ ہجراں سحر ہوئی تو کیا — کیسے امیدِ زندگانی ہے
اب تو باتیں بھی ہو گئیں موقوف — ارنی ہے نہ لن ترانی ہے
دل نہ قابو میں ہے نہ دلبر ہے — موت اس زندگی سے بہتر ہے
تھک گئے کودکانِ سنگ انداز — تیرا دیوانہ ہے کہ پتھر ہے
وہی اچھے جو خانہ ویراں ہیں — گھر بسانا فساد کا گھر ہے

ہزاروں ہیں مجنوں کروڑوں ہیں ناقے — وہ لیلیٰ نہیں ہے وہ محمل نہیں ہے
کیا تنگ تیری دل آزاریوں نے — وہی میں ہوں پر وہ مرا دل نہیں ہے

یار من من کے بگڑ جاتا ہے — کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے
سرکشی دشمنِ سرسبزی ہے — سرو تن تن کے بگڑ جاتا ہے

بت ہو انسان ہو خدا ہو — تم آپ کہو کہ آپ کیا ہو
ظاہر میں تو رنجشیں نہیں ہیں — اے بد باطن تیرا بھلا ہو

اس طرح ہمیں رشک کے کلام میں فقر و فنا اور درویشی کے مضامین بھی تلاش کے بعد مل جاتے ہیں۔ یہ رنگ بھی انھیں آتش یا تلامذہ آتش ہی سے حاصل ہوا ہے۔ ورنہ یہ رنگ ناسخ کے یہاں کہاں۔ اس رنگ میں اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پوچھتے کیا ہو اس فقیر کا حال — اب تو تکیہ فقط خدا پر ہے

فقیر ہوں طمعِ عز و جاہ و مال نہیں — دفا کا دولتِ دنیا پہ احتمال نہیں

ہر دم مجھے بقا و فنا کا خیال ہے — ثابت قدم ہوں زندگیِ بے ثبات میں

یارب ہو بساطِ فقر کامل — جلد تن زار بوریا ہو
کیوں ہے یمِ فقر سے کنارہ — جو ڈوبے اس میں پارسا ہو

یہ بات کبھی ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ شیخ ناسخؔ غزل کا دامن ہندی اور بھاکھا کے الفاظ سے بچانا ہی ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ قطعی طور پر اس کے استعمال کو متروک قرار دیتے تھے لیکن خواجہ آتشؔ اور ان کے تلامذہ کی نظر زبان کے مستقبل پر بھی وہ صرف اس کے جواز کے ہی قائل نہ تھے بلکہ انتہائی حسن کے ساتھ اس کو استعمال بھی کرتے تھے۔ رشکؔ کے کلام میں بھی ہندی الفاظ کا استعمال ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب تلامذہ آتشؔ کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ رشک کے کلام میں ہندی الفاظ کا استعمال ملاحظہ ہو ؎

زلف شب رنگ کا ہر رنگ میں جلوہ پایا — ہم جسے سمجھے تھے کالی وہ کنھیا نکلا

سوزِ دل، اشکِ سرخ زردی ایک — عاشقی ان سبھوں کی بانی ہے

ہوتا نہیں کسی کو تمنائے دل سے فیض — جلوہ بتِ بخیل کا ہے سومنات میں

قسمت الٹی ہے کیا کروں اس کو — دوست دشمن ہے دوش دوں کس کو

خزاں خدا نہ کرے کھیلے باغ میں ہولی — یہ رنگ عارضِ گل کا گلال رکھتے ہیں

محبت ایسی ہے کس راگ میں خداوندا — ہمیں خیال ہے جس کا اسے خیال نہیں

قانع وہ ہوں سمجھتا ہوں تہ کرکے کملیاں — گٹھڑ دھرے ہوئے ہیں دوشالوں کے سامنے

وزیرؔ وفات ۱۸۵۲ء خواجہ وزیر علی وزیرؔ بھی ناسخؔ کے ممتاز شاگردوں میں تھے اور ان کا بیشتر کلام ناسخؔ کے ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے استاد کی طرح یہ بھی مشکل پسندی اور مضمون آفرینی کے دلدادہ تھے۔ رعایت لفظی میں تو انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اگرچہ ان کا مجموعہ کلام ایک حسین مرقع ہے، مگر بیشتر اشعار درد و اثر سے بالکل خالی ہیں۔ خواجہ وزیرؔ کے یہاں بھی کہیں کہیں سادہ و سلیس اشعار نظر آتے ہیں، جو اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ خواجہ وزیر شیخ ناسخؔ کے شاگرد ہونے کے باوجود عصری اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ نمونے کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آج ہم نے لبِ جاناں دیکھا — اے خضر چشمۂ حیواں دیکھا
بادشاہی کی تمنّا نہ رہی — جب سوئے گورِ غریباں دیکھا
ایک ہی جھٹکے میں اے دستِ جنوں — پاس دامن کے گریباں دیکھا

آنکھ سے رومال سرکا بعدِ مرگ — چشمِ تر کا آج پردہ کھل گیا
تم جو بولے ہو گیا ثابت دہن — باتوں ہی باتوں میں عقدہ کھل گیا

اگر پوچھے وہ بربادی ہماری — صبا کہہ دیجیو کچھ خاک اڑا کر
ہزاروں ہو گئے ٹکڑے گریباں — چلے اس ناز سے دامن اٹھا کر

کون جیتا ہے اے صنم مر کے — آؤ تو دیکھ لیں نظر بھر کے
منھ دکھانے کا کس نے وعدہ کیا — منتظر ہیں جو روزِ محشر کے
دیکھیے دن کو رخ سے کیا ٹھہرے — زلف کے مہماں ہیں شب بھر کے

ایک عالم نے جبہ سائی کی — اے بتو تم نے تو خدائی کی

اے جنوں دشت کو چلیں گے ہم — ہے قسم اس برہنہ پائی کی

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی
شاہ کہلائے ہر طرح سے وزیرؔ — بادشاہی نہ کی گدائی کی

ہو رہائی ضعف کی تاثیر سے — نکلیں ہم مثل صدا زنجیر سے
نرم ہے کیا تیرے ابرو کی کماں — کھینچ رہی ہے خامۂ تصویر سے
ہجر میں مرتا نہیں میں اے وزیرؔ — منفعل ہوں موت کی تاخیر سے

اسی طرح خواجہ وزیرؔ کے کلام میں شیخ ناسخؔ کے رنگ کے خلاف فقیری و درویشی کے مضامین بھی کثرت سے مل جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ خواجہ وزیر کا سلسلہ نسب خواجہ بہاء الدین نقش بندی سے ملتا ہے اور گوشہ نشینی اور درویشی انھیں ورثہ میں ملی تھی[1] مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی مسلم ہے کہ ان کے ہمعصر شعرا خاص کر تلامذہ آتشؔ کے رنگ شاعری نے انھیں جزوی طور پر متاثر ضرور کیا ہے، اور انھیں اثرات کی وجہ سے ان کا رجحان فقیری و درویشی کی طرف ہوا۔ بلکہ اس رجحان کو تقویت بھی ملی۔ خواجہ وزیرؔ کا اس رنگ میں کلام ملاحظہ ہو:-

فقیری میں بھی اے دل آسماں پر ہے دماغ اپنا — گدائی بھی کریں تو کاسہ لے کے ماہ کامل کا
فقیری میں وزیرؔ آکے پریاں پانو پڑتی ہیں — یہ نقشِ بوریا اپنے لیے ہے نقش عامل کا

پہنچایا تا بہ کعبۂ مقصود فقر نے — ترکِ لباس جامۂ احرام ہوگیا
کب ہیں حریص بحرِ توکل کے آشنا — موتی کا ایک قطرے ہی میں کام ہوگیا

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۵۰۴۔

خاکساری میں نقشِ پا کی طرح　　رہنما ہیں ہر ایک رہبر کے

خواجہ وزیؔر نے اپنے استاد کے رنگ کے خلاف ہندی بھاکھا کے الفاظ خوب استعمال کیے ہیں یہ دراصل خواجہ آتشؔ اور ان کے شاگردوں ہی کا اثر تھا جو انھوں نے قبول کیا۔ درج ذیل کلام سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خواجہ وزیؔر نے ہندی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں کتنی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

پانی نہیں یہ آپ کے عاشق کا ہے لہو　　کیوں خون پی کے کوڑی دکھائی کٹار نے

کہوں کیا سیم تن کندن سا تیرا جسم جانی ہے　　پسینہ منھ پہ جو آیا ہے یہ سونے کا پانی ہے

لڑائی وصل میں اس جنگجو سے ہونے والی ہے　　کٹاری گلبدن کے پائجامے نے نکالی ہے

تیرہ بختوں کو نہ ہو فائدہ منعم سے کبھی　　جسم اگر چاندی کا بنّتر ہو نہ ہو سایہ سفید

آفتابِ جام ے نکلا تو اس مہہ کے لیے　　بن گیا سورج مکھی ہر ایک پتّہ تاک کا

مانندِ موج اسپ نے جب کی شناوری　　حلقہ بھنور کا بن گیا حلقہ رکاب کا

سوزِ غم سے آب و خاک و باد ہیں آتش مزاج　　چار عنصر کا بنا چو مکھ چراغ خام روح

یہ یاد آتی ہے کس کی اچپلاہٹ　　جو گر پڑتی ہے بجلی تلملا کر

دریا کا گھاٹ ہجر میں تلوار کا ہے گھاٹ　　پانی کی دھار کم نہیں خنجر کی دھار سے

تجرؔ ۱۸۱۰ء تا ۱۸۸۲ء امداد علی تجرؔ بھی ناسخؔ کے باکمال شاگردوں میں تھے۔ اگرچہ ان کے یہاں پیچیدہ فارسی تراکیب اور دقیق استعارات کی فراوانی ہے، مگر پھر بھی ان کے یہاں اکثر اشعار صاف سلیس، اور پراثر نکل آتے ہیں یہ سلاست اور اثر آفرینی یقیناً ہم عصر شعرا کے اثر سے حاصل ہوئی ہوگی اور ان ہمعصر شعرا میں تلامذۂ آتشؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تجرؔ نے بھی تلامذۂ آتشؔ سے اثر قبول کیا ہے۔ بجرؔ کے سادہ سلیس اور پراثر اشعار ملاحظہ ہوں۔

کبھی فریاد تو سنو میری ۔۔۔ کون کہتا ہے تم جفا نہ کرو

غیر پر کیوں نگاہ کرتے ہو ۔۔۔ مجھ کو اس تیر کا نشانہ کرو
جلد آؤ کہ دم نکلتا ہے ۔۔۔ مجھ کو بیٹھو اگر بہانہ کرو
تجرؔ شاکر رہو مقدر پر ۔۔۔ کس و ناکس سے التجا نہ کرو

جان سے عشق کی بلا ٹالو ۔۔۔ دل کو سمجھاؤ چاہنے والو
اے نصیبو یہ بے سبب ایذا ۔۔۔ چین پایا ہو کچھ تو بدلا لو

تجرؔ دربان بے مروت ہے ۔۔۔ ہو چکی راہ گھر کا رستا لو

وہ اٹھ کے چلا تو لوگ بولے ۔۔۔ گل ہوگئی شمع انجمن کی
دے دے کے بل اپنے کاکلوں کو ۔۔۔ لیتے ہیں وہ ہم سے بانکپن کی
وہ زلف ہے گورے منہ پر آفت ۔۔۔ اے تجرؔ نماز پڑھ گہن کی

دکھاتی ہے دل پھر محبت کسی کی ۔۔۔ کہ آنکھوں میں پھرتی ہے صورت کسی کی
ہزار ارمان احباب دنیا سے اٹھے ۔۔۔ فلک نے نکالی نہ حسرت کسی کی

نظر میں ہیں یارانِ رفتہ کے جلسے — خوش آتی نہیں مجھ کو صحبت کسی کی
عبث بحرؔ مرتے ہو تم ہر کسی پر — مبارک نہیں تم کو چاہت کسی کی

جنوں کے جوش میں نکلے جو گھر سے — ادھر سے ہم چلے پتھر ادھر سے
اسے کہتے ہیں قسمت کی برائی — صدف دریا میں ایک قطرے کو ترسے
عدم کا کوچ ہے سامانِ راحت — نمازیں قصر ہوتی ہیں سفر سے

بحرؔ کے یہاں فقیرانہ، اور درویشانہ اشعار بھی بہ کثرت نظر آتے ہیں۔ بحرؔ نے عصری رجحانات سے متاثر ہو کر اپنے کلام میں فقیری اور درویشی کے مضامین کو بھی جگہ دی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس دور میں شاگردانِ آتشؔ کے یہاں اس قسم کے مضامین کی کثرت تھی۔ پھر یہ اثر بھی بحر نے انھیں شاگردان آتشؔ سے ہی قبول کیا ہے۔ اس رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

علائق سے ہو آزادی فقیری اس کو کہتے ہیں — کفن کو بھی نہ رکھے کچھ قلندر ہو تو ایسا ہو

کیا مجھ فقیر پر کرمِ کردگار ہے — رحمت برس رہی ہے سحابِ گلیم سے

خاکساری کا وہ رتبہ ہے کہ اللہ اللہ — رشکِ کعبہ کو ہے سجادۂ محرابی سے
دولت فقر سے میں بھی ہوں غنی اے منعم — بوریا بھی نہیں کم مسندِ کم خوابی سے
ناظمِ ملکِ قناعت ہوں فقیری ہے گواہ — نہ علاقہ مجھے شاہی سے نہ نوابی سے

فقیری کیجیے ایسی یہاں کی مرشدی جیسے — غضب ہے بوریے میں بھی اگر بوئے ریا نکلے

بحرؔ کے یہاں کہیں کہیں تصوف کے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

پردہ دوئی کا اٹھ گیا وحدت کی آنکھ سے · دیکھا مجاز کو جو حقیقت کی آنکھ سے

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا · میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

بحرؔ نے تلامذۂ آتشؔ کے رنگ سے متاثر ہوتے ہوئے ہندی الفاظ و محاورات کو جائز قرار دیا۔ اور ان کا خوب خوب استعمال کیا ہے، ذیل کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس آزادی کے ساتھ بحرؔ نے ہندی الفاظ کا استعمال روا رکھا ہے ؎

طریق کفر میں ہے کون ہم سبق اپنا · کہ ہے بتوں کا جنم پترا کتاب اپنی

وہ انگلیاں ہیں کہ پچکاریاں شہاب کی ہیں · ابیر رنگ کفک[1] سے گلال ہوتا ہے۔

ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسنِ یار · کنھیا ہے وہ جو کہ سنولا گئے

نہ پہنچے چمن تک خزاں آگئی · دلوں کے کنول کھل کے کمھلا گئے

جھولے پڑ جائیں اڑیں تخت پریزادوں کے · رت پھر آئے کہیں اے بار خدا ساون کی

چکوروں نے وزم مارا ہے جس پر · وہ منزل طے نہیں ہوتی قمر سے

ہم عاشقوں سے ظلم بتاں کچھ نہ پوچھیے · ان کافروں کا آج زمانے میں راج ہے

قدم میرے لے کر یہ کہتا ہے مجنوں · میں چیلا ہوں تیرا تو میرا گرو ہے

ٹھنڈی ہوا ہے آج چلو باغ میں پئیں · بھر کر گلابیوں سے کٹورے گلاب کے

---

[1] مہندی لگے ہوئے پاؤں کا تلوا

ہر ایک اپنے روپ میں یوسف جمال ہے ۔۔۔ یعقوب وار دیکھ تو الفت کی آنکھ سے

امیر مینائی ۱۸۲۶ء تا ۱۹۰۰ء اس عہد کے اکثر و بیشتر شعرا نے بالواسطہ یا بلاواسطہ کم از کم جزوی طور پر ہی سہی تلامذۂ آتش سے اثرات قبول کیے ہیں، امیر مینائی بھی امیر لکھنوی کے شاگرد تھے ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اگرچہ امیر مینائی کا بیشتر کلام لکھنوی شاعری کے عام رنگ سے جدا ہے۔ مگر کہیں کہیں ان کے کلام میں سادگی وسلاست تفرد وفنا اور تصوف کے مضامین اور عاشقانہ کلام میں گہرائی اس طرح نظر آتی ہے، کہ بلا تامل یہ کہنا پڑتا ہے کہ امیر کو یہ رجحان ان کے ہمعصر شعرا ہی سے ملا ہے۔ چوں کہ ہمعصر شعرا میں خواجہ آتش اور ان کے تلامذہ ہی اس رجحان اور اس رنگ کی شاعری کے ہمنوا تھے۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ امیر نے بھی تلامذہ آتش سے اثرات قبول کیے۔ ذیل میں امیر کے کچھ ایسے اشعار دیے جاتے ہیں جو بامزہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی سلیس اور سادہ رنگ میں ہیں، اور جو انھیں اس رنگ میں خواجہ آتش اور ان کے شاگردوں سے قریب کر دیتے ہیں ؎

دل جو سینے میں زار سا ہے کچھ ۔۔۔ غم سے بے اختیار سا ہے کچھ
کل تو آفت تھی دِل کی بے تابی ۔۔۔ آج بھی بے قرار سا ہے کچھ

عکس آئینہ سے یہ ظاہر ہے ۔۔۔ تو ہی اول ہے تو ہی آخر ہے
جان سی چیز دی نہیں جاتی ۔۔۔ پر کروں کیا تمھاری خاطر ہے
کوئی مہمان سرائے ہے دنیا ۔۔۔ جو ہے اس گھر میں وہ مسافر ہے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے ۔۔۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
یہاں دردسے ہاتھ سینے پہ رکھا ۔۔۔ وہاں ان کو گزرے گماں کیسے کیسے

آنکھ مجھ سے دل ملے اغیار سے — یار وہ در گزرا ایسے پیار سے
لے چلے غربت جو صحرا کی طرف — مل کے روئے ہم در و دیوار سے
تھے وہ موسیٰ غش پہ غش آیا جنہیں — یاں تو آنکھیں کھل گئیں دیدار سے
گرمیاں کرنے گئی تھی رات کو — رو کے اٹھی شمع بزمِ یار سے

بڑی بے وفا عمرِ رفتہ تھی ہائے — مسافر کو رستے میں لٹوا گئی
عدم کا بھی رستہ نہ سیدھا رہا — کہ اس کی کمر آج بل کھا گئی
الٰہی شبِ غم میں اتنا تو ہو — کوئی جھوٹ کہہ دے سحر ہو گئی
ہمیں سر پٹکتے ہی گزری امیرؔ — یوں ہی عمر ساری بسر ہو گئی
میں حیراں ہوں وہ زلف رخ دیکھ کر — سرِ شام کیوں کر سحر ہو گئی

امیرؔ کے متصوفانہ مضامین ملاحظہ ہوں ۔

حسنِ مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا — لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ میرا کاشانہ تھا
دی گئی منصور کو سولی ادب کے ترک پر — تھا انا الحق حق مگر اک حرفِ گستاخانہ تھا

ہم جس کی ہوس میں ہیں امیرؔ آپ سے باہر — وہ پردہ نشیں گھر سے بھی باہر نہیں ہوتا

فقیری و درویشی کے مضامین دیکھیے۔

فقیر اللہ کے ہیں بوریائے فقر ہے بستر۔ — توکل پر نظر تکیہ ہے اپنا ذاتِ باری پر

ہم کو وزیر سے نہ کسی شاہ سے غرض — اللہ کے فقیر ہیں اللہ سے غرض

یہ ملا اوج خاکساری سے — کہ قدم آسمان لیتے ہیں

تھا چار طرف اسی کا جلوہ   کیوں نعش ہماری قبلہ رو کی

امیر مینائی کے یہاں بھی ہندی کے الفاظ جا بجا انتہائی حسن کے ساتھ مستعمل نظر آتے ہیں۔

بے خودی سے وصل میں کھنڈت پڑی   گھر میں وہ آئے تو ہم باہر چلے

سیکڑوں ڈوب مرے چاہ ذقن میں تیرے   اس بھنور سے کوئی کشتی نہ سلامت نکلی

میں جب کہتا ہوں اس سے مجھ کو تیری شرم نے مارا
تو شوخی سے حیا الزام رکھ دیتی ہے چتون پر

ہو جو مسجد میں دل گرفتہ امیرؔ   کسی بھٹی پہ کیوں نہ چل بیٹھو

اس طرح امیرؔ مینائی کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے موجود ہیں جن کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ امیرؔ کے یہاں تلامذہ آتشؔ کی چھاپ موجود ہے اور کہیں کہیں تو نمایاں طور سے خواجہ آتشؔ کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

جلالؔ ۱۸۰۹ء تا ۱۹۰۹ء | حکیم ضامن علی جلالؔ ناسخؔ کے محبوب شاگرد میر علی اوسط رشکؔ کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔

ابتدا میں ناسخؔ کے رنگ سخن کو اپنایا۔ لفظی صناعی، قافیہ پیمائی اور بلندیٔ خیال پر زور دیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ناسخؔ اور آتشؔ کا حسین امتزاج جلالؔ میں نظر آنے لگا۔ اگر وہ ایک طرف ناسخؔ کے مزاج شاعری کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھے تو دوسری جانب وہ آتشؔ اور تلامذہ آتشؔ کی غزلیت اور سلاست و روانی کو بھی انتہائی حسن کے ساتھ نباہتے رہے۔

جلال نے اپنے کلام میں اگر عربی فارسی کے الفاظ اور فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے، تو ہندی کے عام فہم اور رائج الوقت الفاظ و مصطلاحات کو بھی جگہ دی ہے، نمونے کے طور پر جلال کے کچھ اشعار دیے جا رہے ہیں جو سلاست و روانی اور واردات قلبیہ کے لحاظ سے شاگردانِ آتش سے قریب تر ہیں ؎

اس جفا پیشہ کو وفا کا مری — ڈر ہے آ جائے کچھ یقیں نہ کہیں
اف نہ کرنا کہ تیری چپ میں جلال — دل بھی ہل جائے گا کہیں نہ کہیں

کوئی یہ پوچھ دے دردِ نہاں سے — تجھے دِل ڈھونڈ لایا ہے کہاں سے
لہو اتنا تو ہو ڈوبے وہ پیکاں — بہت شرمائے گا دل میہماں سے

قابل لطف کوئی اور سہی — خیر ہم پر ستم و جور سہی
دِل مرا لاؤ مجھے دے بھی چکو — بلکہ ایسا ہی دل ایک اور سہی

پوچھنا میری آرزو مجھ سے — پھر یہ رنجش کی گفتگو مجھ سے
چپکے چپکے ہی دل کے ہیں خواہاں — نہ اشارے نہ گفتگو مجھ سے

شب وعدہ ہے، تو ہے اور میں ہوں — ہجوم آرزو ہے اور میں ہوں
گلستانِ جہاں ہے قابل سیر — طلسم رنگ و بو ہے اور میں ہوں

کرشمے لاکھ ان کی ہر ادا میں — ہزاروں شوخیاں ہیں اک حیا میں
بہت پچھتائے ایک بے درد کو ہم — جگہ دے کر دل درد آشنا میں
جلال اپنی تمنائیں تھیں جتنی — نہ سب بر آئیں ترک مدعا میں

اٹھا کیوں یہ درد جگر بیٹھے بیٹھے　　کوئی یاد آیا مگر بیٹھے بیٹھے
چلو دشت کو کہتی ہے وحشت دل　　ہم اکتا گئے اب تو گھر بیٹھے بیٹھے

کیوں سہتے جفا پاس وفا کا جو نہ ہوتا　　جا رہتے ترے کوچے سے گھر دور بنا کر

دلِ وحشی کو مرے ہوش میں لاتے کیوں ہو　　اور دیوانے کو دیوانہ بناتے کیوں ہو

جلاؔل کے یہاں جا بجا فقر و فنا اور درویشی کے مضامین بھی مل جاتے ہیں

بستر فقر ہے مسند سے سوا مجھ کو جلاؔل　　اپنے اللہ پہ ہر وقت ہے تکیہ میرا

پہنچے ہوئے جو حضرت دل آپ ہیں فقیر　　دہ آسلے کچھ ایسے کرامات کیجیے

جلاؔل خاندان ناسخؔ سے تعلق رکھتے تھے اور اصلاح زبان کا وہی ولولہ ان کے یہاں بھی تھا جو ناسخؔ کے یہاں موجود تھا۔ انھوں نے نئے سرے سے زبان کی اصلاح شروع کی اور ایسے الفاظ ترک کیے جو یا تو غیر مانوس اور غیر فصیح تھے یا پھر لغوی حیثیت سے غلط تھے انھوں نے اساتذہ کی اندھی تقلید اور روایتی انداز شاعری کو پسند نہیں کیا انھوں نے تلامذہ آتش کے زیر اثر ہندی کے عام فہم الفاظ کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ذیل کے انتخاب کلام سے ان کی وسیع النظری کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

ایسا نہ ہو وہ روک لیں خنجر کو دم ذبح　　حسرت کی نگہ قہر کی چتون سے نہ لڑ جائے
گھبرا رہا ہے سینے میں دل کو یہ فکر ہے　　قاصد ہی بن کے جائیے کچھ گھات کیجیے
خدا کبھی مرضِ عشق آدمی کو نہ دے　　کہ روگ جان کو دل کا عذاب ملتا ہے

اٹھے ہم مر کے اس محفل سے کچھ غیرت بھی رکھتے ہیں

جہاں پہلو میں دل تھا اک کمر میں بھی کٹاری تھی

سدھ نہیں بھولا ہوا ہے دونوں عالم کو جلال

اک یہی پہچان ہے اے یار تیری یاد کی

آنکھیں مجھے جس طرح دکھاتا ہے مرا دل
ان سے بھی ہو سر کبھی اسی تیور سے نکل کر

دیوانہ تری چشم کا یوں رام کرے گا
انداز ہی وحشت کے ہرن میں نہ رہیں گے

تڑپ نے دل کی اچھالا ہزار فرقت میں
ہماری چھاتی کا پتھر مگر اچھل نہ سکا

اس طرح اس دور میں لکھنؤ کی شاعری پر تلامذہ آتش کا رنگ دھیرے دھیرے چڑھتا جا رہا تھا، اور چوں کہ تلامذہ آتش کا رنگ قدما کے رنگ سے قریب تر تھا اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا، کہ تلامذہ آتش کی معرفت قدیم رنگ کی شاعری، لکھنوی شعراء پر غلبہ پاتی جا رہی تھی اور پھر بعد کو تو لکھنؤ کا پورا شعری مزاج ہی تلامذہ آتش کے رنگ میں رنگ گیا، اور ناسخ کے اثرات دھیرے دھیرے ختم ہوتے گئے لوگوں نے رفتہ رفتہ وہی رنگ شاعری اختیار کر لیا تھا جس میں غزلیت زیادہ اور آورد کم ہو۔ اس طرح شاگردانِ آتش سادگیِ زبان بے ساختگیِ جذبات، اور واردات قلب کے جو سبق ہم عصر شعرا کو سکھائے تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ یہ رنگ لکھنؤ کی شاعری میں عام ہو گیا، اور بیشتر شعرا اسی رنگ میں شعر کہنے لگے۔ تلامذہ آتش کے یہ اثرات صرف لکھنؤ تک ہی محدود نہ تھے بلکہ دھیرے دھیرے دلی کے شعرا بھی اسے قبول کرنے لگے۔

کتابیات

نام کتاب	مصنف
اردو مثنوی کا ارتقا	شیخ ممتاز حسین جونپوری
اردو مثنویاں	پروفیسر گوپی چند نارنگ
انتخاب وحید	وحیدالدین وحید
امیر مینائی	ممتاز علی آہ
افسانہ لکھنؤ (قلمی)	آغا حجو شرف
اردو زبان کا ارتقا	شوکت علی سبزواری
افادات	خورشید لکھنوی
آتش	مرتضیٰ حسین فاضل
امیراللغات	امیر مینائی
تاریخ اودھ پانچ جلد	نجم الغنی
تاریخ دریاباد	منشی برج بھوکن لال محب
تاریخ محاربہ غدر (نونگہ)	بھوانی پرشاد
تاریخ ادب اردو	حامد حسین قادری
تاریخ بوستان اودھ	کنور درگا پرشاد
تاریخ امیر نامہ	امیر علی خاں
تاریخ وزیر نامہ	امیر علی خاں
تاریخ عمادالسعادت	غلام علی
تاریخ آئینہ اودھ	ابوالحسن
تاریخ ضیائے اختر	

تاریخ سوانح حیات سلاطین اودھ (قیصر التواریخ)	کمال الدین حیدر حسینی
تذکرہ آثار الشعراء ہنود	دیبی پرشاد بشاش
تذکرہ بہار سخن	شیام سندر لال برق
تذکرہ۔ رشک چمن مسمّٰی بہ بزم سخن	سید علی حسن خاں
تذکرہ شعر و سخن	نیاز علی پریشان
تذکرہ۔ خوش معرکہ زیبا	ناصر علی ناصر
تذکرہ۔ سخن شعراء	نسّاخ
تذکرہ۔ سراپا سخن	محسن
خم خانہ جاوید پانچ حصے	لالہ سری رام
تذکرہ یادگار ضیغم	عبد اللہ خاں ضیغم
تذکرہ ہندو شعراء	عبدالرؤف عشرت
تذکرہ گلستان بے خزاں	قطب الدین باطن
تذکرہ طبقات الشعراء	کریم الدین
تذکرہ۔ انتخاب یادگار	امیر مینائی
تذکرہ شوق	عطاء اللہ پالوی
تذکرہ آب بقا	عبدالرؤف عشرت
تذکرہ۔ تجلیات سخن	ملا عبدالقادر بدایونی
تذکرہ مدائح الشعراء	عنایت حسین خاں مہجور
تذکرہ شوکت نادری (قلمی)	کلب حسین خاں نادر
تذکرہ عیار الشعراء (قلمی)	خوب چند ذکار
تذکرہ۔ گلدستۂ نازنیناں	مولوی کریم الدین
تذکرہ مجموعہ نغز	حکیم قدرت اللہ قاسم
تذکرہ گلشن بے خار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

تذکرہ۔ جلوہ خضر دو جلد	صفیر بلگرامی
تذکرہ شمیم سخن	عبدالحی صفا
نغمۂ عندلیب	باطن اکبرآبادی
تذکرۂ غنچۂ ارم	علی نجف
تذکرہ۔ آثارالشعراء	مولوی ممتاز احمد
تذکرہ۔ ماہ درخشاں	ابوالقاسم
تذکرہ کاملان رامپور	حافظ احمد علی خاں شوق
تذکرہ۔ جواہر سخن چار جلد	کیفی چریاکوٹی
تذکرہ۔ خندۂ گل	عبدالباری آسی
تذکرہ۔ گلشن ہمیشہ بہار	نصراللہ قمر
تذکرہ۔ صبح گلشن	صدیق حسن خاں
تذکرہ۔ روز روشن	مظفر حسین ضیاء
تذکرہ جہاں	بینی نرائن جہاں
تذکرہ۔ ریاض الفصحاء	غلام ہمدانی مصحفی
تذکرہ۔ ہندی گویاں	غلام ہمدانی مصحفی
تذکرہ۔ عقد ثریا	غلام ہمدانی مصحفی
تذکرہ۔ آب حیات	محمد حسین آزاد
تذکرہ ناموس المشاہیر	نظامی بدایونی
تذکرہ۔ طور کلیم	نورالحسن خاں
تذکرہ۔ گل رعنا	عبدالحی
تجلیات	محمد ہادی عزیز لکھنوی
جلال	ڈاکٹر محمد حسن
حسن خیال	صفدر مرزاپوری

خطوط غالب	مرتبہ غلام رسول مہر
دیوان منتہی (نگارستان فصاحت)	مستیا بیگ منتہی
دیوان صبا (غنچہ آرزو)	میر وزیر علی صبا
دیوانِ خلیل (گلزار خلیل قلمی)	میر دوست علی خلیل
دیوان غریب	کلب حسین خاں نادر
دیوان اعظم	اعظم علی بیگ اعظم
دیوان حنا (قلمی)	عبدالکریم خاں حنا
دیوان اصغر (قلمی)	اصغر علی خاں اصغر
دیوان نسیم	دیا شنکر نسیم
دیوانِ کیف (آئینہ ناظرین)	فضل احمد کیف
دیوان رند (گلدستہ عشق)	سید محمد خاں رند
دیوان ماہ	عنایت علی بیگ ماہ
دیوانِ آتش	خواجہ حیدر علی آتش
دیوانِ ناسخ	شیخ امام بخش ناسخ
دیوان جنوں (مصباح النظم)	نواب سراج الدولہ جنوں
دیوان جنوں (سراج النظم)	نواب سراج الدولہ جنوں
دیوان قلق (مظہر عشق)	آفتاب الدولہ قلق
دیوان امیر (صنم خانہ عشق)	امیر مینائی
دیوان امیر (مراۃ الغیب)	امیر مینائی
دیوان رشک (نظم مبارک)	میر علی اوسط رشک
دیوان رشک (نظم گرامی)	میر علی اوسط رشک
دیوانِ جلال (مضمون ہائے دلکش)	ضامن علی خاں جلال
دیوان جلال (نظم نگارین)	ضامن علی خاں جلال

دیوان جلال (کرشمہ گاہ سخن)	ضامن علی خاں جلال
دیوان بحر (ریاض البحر)	امداد علی بحر
دیوانِ وزیر (دفتر فصاحت)	خواجہ وزیر علی خاں وزیر
دیوان مہر (الماس درخشاں)	حاتم علی بیگ مہر
دیوان صد غزل	تاسف مرتبہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی
دلی کا دبستان شاعری	نور الحسن ہاشمی
دو ادبی اسکول	علی جواد زیدی
ذوق و جستجو	خواجہ احمد فاروقی
شعر الہند ۲ حصے	عبد السلام ندوی
شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقاء	پروفیسر گیان چند جین
شعلہ جوالہ ۲ حصے	مجموعہ داسوخت مرتبہ عیش
طومار اغلاط	مولوی عظمت اللہ النسخ
فرہنگ آصفیہ	سید احمد
کلیات آتش	مرتبہ ڈاکٹر ظہیر صدیقی
کاشف الحقائق	امداد علی امام اثر
کلیات نصیر الدین حیدر	نصیر الدین حیدر شاہ اودھ (قلمی)
گذشتہ لکھنؤ	شرر
لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
مراۃ الشعراء	محمد یحیٰ تنہا
مقدمہ کلام آتش	ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی
مشاطۂ سخن	صفدر مرزاپوری
مرکز سخن	عبد الباری آسی
مقالات عبد السلام	عبد السلام ندوی

مثنویات دبستان لکھنؤ (قلمی)	ڈاکٹر سید سلیمان حسین
مثنویات شوق	نواب مرزا شوق لکھنؤ نول کشور
معیار سخن (گلدستہ)	مرتبہ آغا حسین ہجر
معرکہ چکبست و شرر	
نگارشات ادیب	مسعود حسن رضوی
ناسخ	ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی
نوراللغات	نور الحسن
نذر مقبول	مرتبہ خیر بہوروی
وقائع دلپذیر	عبد الاحد رابط (اردو ترجمہ)

رسائل و جرائد

رسالہ ادیب الہ آباد	۱۹۱۰-۱۱-۱۲-۱۳
رسالہ نگار لکھنؤ	۱۹۴۸-۵۷-۶۳-۶۵
الناظر لکھنؤ	۱۹۱۷-۲۰-۲۴-۲۹-۳۰
نیا دور لکھنؤ	۱۹۷۵-۷۴-۷۳
اردوئے معلیٰ علی گڑھ	۱۹۱۲-۱۳-۲۱
معارف اعظم گڑھ	۱۹۲۱-۲۸
جامعہ دہلی	۱۹۶۸-۷۱-۷۳
نگار لکھنؤ	۱۹۵۷-۵۸-۶۰-۶۲

نئی اور اہم مطبوعات

مفتی صدر الدین آزردہ	پروازؔ اصلاحی	۱۲/-
اُردو گیتوں کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر قیصر جہاں	۱۲/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے	مولانا عبد السّلام قدوائی	۸/-
انشائیات	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۵/-
فسانۂ غالب	مالک رام	۱۶/۵۰
تذکرۂ معاصرین دوم	مالک رام	۱۴/-
حیاتِ اسماعیل میرٹھی	ڈاکٹر سیفی پریمی	۱۸/-
نوائے آوارہ	غلام ربانی تاباںؔ	۸/۵۰
کربِ آگہی	آنند نرائن ملاؔ	۶/-
کو بہ کو	سلمان اختر	۶/-
تعلیم اور سماج	سعید انصاری	۵/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	مسرور ہاشمی	۸/-
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
گاندھی باباکی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	۴/-
دلّی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	۶/-
ذکرِ غالب	مالک رام	۱۵/-
رموزِ غالب	ڈاکٹر گیان چند	۱۸/۵۰
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	۴/-
اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزادؔ	۱۰/۵۰
جدید اُردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۳/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نرائن ملاؔ	۱۹/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا	محمود الحسن	۱۵/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبد اللطیف اعظمی	۱۲/۵۰
اُردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۴/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	۶/-
بیاضِ مریم	سکندر علی وجدؔ	۱۲/-
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
سماجی تبدیلیاں ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں	رام شرن شرما	۲/-
قدیم دلّی کالج	مالک رام	۴/۵۰
انتخابِ حالیؔ	مرتبہ: سفارش حسین رضوی	۹/۵۰
یادوں کے سائے	عتیق صدیقی	۱۸/-
تلاشِ میرؔ	نثار احمد فاروقی	۱۱/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباںؔ	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکانِ ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
مذہب اور جدید ذہن	ڈاکٹر مشیر الحق	۶/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
فکر اور نظریے	آل احمد سرورؔ	۱۲/۵۰
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۹/-

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲